اس کتاب کے جملہ حقوق تصنیف بحق مصنف محفوظ ہیں

ریاض اردو

(برائے افادہ طلبائے ورنیکلر فائنل و میٹرک)

مصنفہ

سراج الدین امین منشی فاضل۔ او۔ ٹی

ڈی۔ بی ہائی سکول کھُڈیاں ضلع لاہور

پبلشرز

قاضی سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز

جان محمد روڈ۔ انارکلی۔ لاہور

بار اول ۱۰۰۰ —— قیمت

حوالہ نیوز پرنٹ پرمٹ نمبر ۹۹۷ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۵۶ء

اپنے لڑکے

ریاض الدین کے نام

امین

۷۸۶

ریاضِ اُردو

اُردو زبان اُس وقت معرضِ وجود میں آئی جب ہندوستان میں شاہجہانی اقبال کا ستارا چمک رہا تھا اور اس مُغل بادشاہ کی داد و دہش سے فیض یاب ہونے کے لئے دُنیا بھر کے لوگ ہندوستان کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے۔ اگرچہ اس سے پہلے اکبر اور جہانگیر کے عہد ہائے سلطنت میں بھی ہمسایہ ممالک کے لوگ کافی تعداد میں آ چکے تھے اور اس سے بہت پہلے مسلمان حملہ آوروں کے اثر سے اسلامی زبانیں (عربی و فارسی) نے ہندوستان کی زبانوں پر کافی اثر ڈالا تھا۔ لیکن اب یہ عالم تھا کہ افغانستان، ترکستان۔ ایران۔ ترکی اور عرب ممالک کے باشندوں کے علاوہ انگریز بھی ہندوستان میں آ چکے تھے۔ ہر نو وارد اپنی زبان کے علاوہ دُوسری زبانیں بولنے اور سمجھنے پر مجبور تھا۔ اس لیئے تمام ممالک کی زبانوں کا ہندوستان کی پراکرتوں (بنگالی۔ مدراسی۔ گجراتی۔ پنجابی وغیرہ) کے ساتھ مل کر ایک نئی زبان کا پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ چنانچہ ایک نئی زبان پیدا ہوئی جو شاہجہانی لشکر میں خصوصاً بولی جاتی تھی۔ چونکہ ترکی زبان میں اُردو لشکر کو کہتے ہیں۔ اس لیئے اس زبان کا نام اُردو رکھا گیا اور یہ زبان اس وقت ہندوستان کے عوام میں بولی جانے لگی۔ اور عہد بعہد کی ترقیوں کے بعد اب اس قابل ہو گئی ہے کہ دُنیا بھر میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء کے انقلابِ سلطنت کے بعد جب پاکستان کا وجود عالمِ شہود میں آیا۔ ہندوستان کی حکومت نے ہندی کو اپنی قومی زبان قرار دیا اور ایسے احکام نافذ کر دیئے۔ جن کی رُو سے دفتری زبان ہندی قرار دے دی گئی اور تمام

محکموں میں کام کرنے والے ملازمین کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ ہندی سیکھیں ورنہ ملازمت سے علیحدہ کر دیئے جائیں گے۔ ہندوستانی حکومت کا یہ اقدام اگرچہ حالات کے مطابق صحیح نہ تھا کیونکہ ہندوستان میں بسنے والی تمام قومیں اس وقت اردو کے آغوش میں پرورش پا کر جوان ہو چکی ہیں اور اردو کا اثر ان سے دور کرنا غیر طبعی بات ہے لیکن ہندوستانی ہندو مدبر ایسا کرنے کے لیئے مجبور بھی تھے کیونکہ ہندی ان کی قدیم الایّام کی زبان تھی جو گردش زمانہ سے مٹ چکی تھی اور اب جب کہ ہندو قوم کو آزادی نصیب ہوئی انہوں نے اس اصول کو گرہ میں باندھ لیا کہ

"کوئی قوم اس وقت تک زندہ اور آزاد نہیں رہ سکتی جب تک اس کی زبان زندہ نہ ہو۔"

اب دولتِ خداداد پاکستان نے اردو کو اپنی ملکی زبان قرار دے دیا ہے اور یہ قرار داد قدرتی اصول پر مبنی ہے۔ کیونکہ اردو ہمارے آباؤ اجداد کی زبان ہے۔ جو کئی سو سالوں سے بولی جاتی ہے۔ پس ہمارا فرض ہے کہ اردو ہی کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنائیں خواہ وہ اظہار تقریری ہو یا تحریری اور اس اصول کو نہ بھولیں کہ اردو کی ترقی سے ہماری قومی ترقی وابستہ ہے۔ اردو کی اس اہمیت کو سمجھنے کے بعد ان اصولوں کا جاننا ضروری ہے۔ جن پر کاربند ہو کر ہم اردو تحریر و تقریر کو اس قابل بنا دیں۔ جس سے وہ ایک فصیح و بلیغ زبان بن جائے۔ اور وہی درجہ حاصل کر سکے جو اس وقت دنیا کی ممتاز زبانوں کو حاصل ہے۔ اگرچہ کسی زبان کی تکمیل اس کی گرامر سے ہوتی ہے۔ لیکن میں یہاں گرامر کے تمام اصول و قواعد پر بحث نہیں کروں گا۔ اور اگر خدا تعالےٰ نے توفیق بخشی تو انہیں الگ کتاب کی شکل میں پیش کروں گا۔ اس وقت میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اردو کے روزمرّہ اور محاورہ کے وہ قواعد لکھوں جن پر عمل پیرا ہو کر ہمارے لوگ

صحیح اُردو لکھنا اور بولنا سیکھ جائیں۔ اور اُن کے ساتھ چند مضامین بطور نمونہ لکھ دُوں تاکہ ہر مبتدی جان لے کہ کسی موضوع پر خیالات کو کس طرح آراستہ کیا جا سکتا ہے۔ خدا کرے کہ ریاضِ اُردو کے یہ سدا بہار پھول طلباء و طالبات کے مشامِ طبع کو معطّر کرنے کے لئے کافی ہوں ؂ (آمین)

۷۸۶

اُردو کے حروفِ تہجّی

اُردو زبان کے مندرجہ ذیل حروفِ تہجی ہیں۔ جن سے اس زبان کے الفاظ بنتے ہیں:-

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف
ق ک گ ل م ن و ہ ء ی ے۔

چونکہ اُردو زبان عربی۔ فارسی اور ہندوستانی زبانوں کے میل جول سے بنی تھی اس لیئے جاننا چاہیئے کہ ان حروفِ تہجی میں ان سب زبانوں کے حروف شامل ہیں اور ٹ۔ ڈ۔ ڑ خالص ہندی حروف ہیں۔ فارسی اور عربی زبانوں میں نہیں بولے جاتے۔ اسی طرح بھ۔ پھ۔ تھ۔ ٹھ۔ جھ۔ چھ۔ دھ۔ ڈھ۔ ڑھ۔ کھ۔ گھ۔ لھ۔ مرکب حروف جو اُردو زبان میں بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ خالص ہندی ہیں اور صرف اُردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ فارسی اور عربی الفاظ میں نہیں آتے۔ اسی طرح پ۔ چ۔ ژ۔ گ خالص فارسی حروف ہیں۔ جن لفظوں میں یہ حروف آئیں وہ فارسی یا اُردو کے الفاظ ہوں گے۔ اہلِ عرب کی زبان پر یہ چاروں حروف نہیں چڑھتے۔ اور عربی میں ان کا نام و نشان نہیں ملتا۔

ان خالص ہندی و خالص فارسی حروف کے علاوہ باقی حروف تمام زبانوں یعنی عربی۔ فارسی اور اُردو میں استعمال ہوتے ہیں+

ء کا استعمال

ء کا استعمال صرف عربی زبان میں تھا۔ فارسی میں بالکل نہ تھا۔ لیکن جب عربی کا فارسی پر اور پھر عربی و فارسی کا اُردو پر اثر پڑا تو اردو اور فارسی الفاظ میں بھی ء کا استعمال ہونے لگا۔

بعض لوگ ء کو اعراب میں شمار کرتے ہیں۔ اور زبر، زیر اور پیش کے ساتھ ء کو بھی اسی زمرہ میں لاتے ہیں۔ اور بعض حضرات اسے ع کی مختصر صورت قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں باتیں نہیں اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ء کا استعمال محدود ہے۔ اور حروفِ علت (و۔ا۔ی) کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں:۔

(۱) صرف یؔ کی بجائے جیسے قائد۔ نمائندہ ہیں۔ کیونکہ دراصل یہ الفاظ قاید اور نماینده تھے۔

(۲) جب دو واؔو یا دو الفؔ یا دو یائے اکٹھے ہوں اور مشدد نہ ہوں تو ایک حرفِ علت کی بجائے ءؔ استعمال کرتے ہیں۔ جیسے پئے۔ دئے وغیرہ میں دو یائے جمع ہیں اور ایک کی جگہ ءؔ لکھا ہے۔ یا گاؤں میں دو واؤ اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک کو ءؔ سے بدل دیا۔ یا کیکا ایک رانا کا نام تھا۔ مؤنث کی ضرورت کے لئے اؔ کو ءؔ سے بدل کر یائے تانیث لگادی اور کیکئی ایک رانی کا نام رکھا گیا۔

یاد رہے کہ صرف حروفِ علت کے اکٹھے ہونے کی صورت میں کسی حرفِ علت کی بجائے ءؔ استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر یہ حروف یکجا نہ ہوں تو پھر ان کی بجائے ءؔ نہیں آتا+

حساب جمل

عربوں نے حروف کے اعداد بھی مقرر کئے تھے۔ اور یہ کام جن اُستادوں نے کیا اُن کے ناموں ہی سے حروف کی مندرجہ ذیل تختیاں بنا کر اعداد مقرر کئے گئے ہیں :-

ابجد

ا	ب	ج	د
۱	۲	۳	۴

ہوز

ہ	و	ز
۵	۶	۷

حطی

ح	ط	ی
۸	۹	۱۰

کلمن

ک	ل	م	ن
۲۰	۳۰	۴۰	۵۰

سعفص

س	ع	ف	ص
۶۰	۷۰	۸۰	۹۰

قرشت

ق	ر	ش	ت
۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰

ثخذ

ث	خ	ذ
۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰

ضظغ

ض	ظ	غ
۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

اسے حساب ابجد بھی کہتے ہیں اور اس سے کسی شخص کی پیدائش۔ وفات۔ کسی عمارت کی تعمیر یا کسی واقعہ کا سن نکالنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اور ایسے الفاظ بنائے جاتے ہیں جن کے حروف کے اعداد کا مجموعہ مطلوبہ سال کو ظاہر کرے۔ ایسے الفاظ نثر میں ہوں یا نظم میں (مگر عام طور پر نظم ہی میں ہوتے ہیں۔) مادہ کہلاتے ہیں۔ مثلاً ریاض الدین آرام کے عدد نکالیں :-

ر	ی	ا	ض	ا	ل	د	ی	ن	ا	ر	ا	م	
۲۰۰	۱۰	۱	۸۰۰	۱	۳۰	۴	۱۰	۵۰	۱	۲۰۰	۱	۴۰	} ۱۳۴۸ ہوتے ہیں۔

اور یہی ۱۳۴۸ھ برخوردار ریاض الدین آرام کا سِن پیدائش ہے۔ گویا نام ایسا ہے جس سے سِن پیدائش نکلتا ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر ریاض قدیر صاحب جو میو ہسپتال کے مشہور سرجن ہیں ان کے نام ریاض قدیر سے اُن کا سِن پیدائش نِکلتا ہے۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر راقم نے چار مادے نکالے تھے۔ جن سے اُن کا سن وفات نِکلتا ہے:- (۱) جناح رخصت ہے۔ قطعہ:-

آہ دُنیا میں کس کا ماتم ہے — دوشِ ملّت پہ کِس کی میّت ہے
ہو گیا آج دارِ فانی سے — کہدے امینؔ۔ جناح رخصت ہے

۱۳۶۷

(۴) ہادی رازِ مغفرت	(۳) غفران الہ	(۲) امر قائدِ اعظم
۱۹۴۸ء	۱۳۶۷ھ	۱۳۶۷ھ

فارسی اور ہندی حروف کی بجائے عربی حروف کے اعداد اس طرح حاصل کرتے ہیں:-

پ = ب۔ ٹ = ت۔ ڈ = د۔ ڑ = ر۔ چ = ج۔ ژ = ز۔ گ = ک۔

مرکب حروف بھ۔ پھ وغیرہ دو حرف ب۔ ہ اور پ۔ ہ وغیرہ شمار ہوتے ہیں۔

حروفِ شمسی و قمری

بعض عربی الفاظ ایسے ہیں۔ جن سے پہلے اَل آئے تو لؔ پڑھا جاتا ہے اور بعض ایسے ہیں کہ ان سے پہلے اَل آئے تو لؔ نہیں پڑھا جاتا بلکہ لؔ کے بعد کا

حرف پہلے لفظ کے آخری حرف سے مل کر مشدد پڑھا جاتا ہے۔ مثلاً قائمُ الزّاویہ میں ل نہیں پڑھا جاتا اور ز کا حرف قائم کے میم کے ساتھ مل کر پڑھا جاتا ہے۔ اور اسے قائمز زّاویہ کی آواز سے پڑھیں گے۔ لیکن ملک الموت میں ل کو پہلے لفظ کے آخری حرف ک سے ملا کر ملکلموت کی آواز سے پڑھیں گے۔

چونکہ عربی کے ایسے صدہا الفاظ اردو میں مستعمل ہیں۔ اس لئے ایسے حروف کا جاننا ضروری ہے۔ جن سے پہلے ل پڑھا جاتا ہے۔ یا نہیں پڑھا جاتا۔ تاکہ ال والے الفاظ پڑھنے میں غلطی نہ ہو۔

جن حروف سے پہلے ال کا ل نہیں پڑھا جاتا انہیں شمسی حروف کہتے ہیں۔ کیونکہ الشمس میں ل نہیں پڑھا جاتا اور جن حروف سے پہلے ال کا ل پڑھا جاتا ہے۔ انہیں قمری حروف کہتے ہیں۔ کیونکہ القمر میں ل پڑھا جاتا ہے۔

شمسی حروف یہ ہیں:۔ ت۔ ث۔ د۔ ذ۔ ر۔ ز۔ س۔ ش۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ن۔

اور قمری حروف یہ ہیں:۔ ا۔ ب۔ ج۔ ح۔ خ۔ ع۔ غ۔ ف۔ ق۔ ک۔ ل۔ م۔ و۔ ہ۔ ی۔

شمسی حروف کی مثالیں دیکھیں:۔ واجبُ التّعمیل۔ مسلّمُ الثّبوت۔ سراج الدّولہ۔ اہل الذّکر۔ عبد الرّحیم۔ قائم الزّاویہ۔ باب السّخی۔ عمل الشّیطان۔ دار الصّفا۔ مافی الضّمیر۔ عبد المطّلب۔ سوءِ الظّن۔ ذو النّون۔

قمری حروف کی مثالیں دیکھیں:۔ دار الادب۔ عبد الباری۔ بالجبر۔ زبدۃ الحکماء۔ خاص الخواص۔ صاحبُ العلم۔ عبد الغنی۔ جنت الفردوس۔ علم القرآن۔ عبد الکریم۔ عبد اللطیف۔ ملک الموت۔ عبد الوہاب۔ عبد الہادی۔ عقیق الیمین۔

اِن تمام الفاظ میں اَل کا لؔ پڑھا جاتا ہے۔

نوٹ:۔ شمسی حروف ہوں یا قمری ان سے پہلے جب اَل آتا ہے تو ا کسی حالت میں بھی نہیں پڑھا جاتا۔ اور ایسے مرکب الفاظ میں اَل حرفِ اضافت کا کام دیتا ہے۔ جس کے معنی کا کے اور کی ہوتے ہیں۔ لیکن جب کسی لفظ کے پہلے اَل ہو اور مضاف اس کے ساتھ نہ آئے تو اَل سے وہی معنے لئے جاتے ہیں۔ جو انگریزی میں (The) کے معنی لئے جاتے ہیں۔ جیسے الرّجل (The man)۔

الفاظ

دو یا دو سے زیادہ حروف مل کر لفظ بنتا ہے۔ اور الفاظ دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱) مفرد الفاظ۔ جیسے کل۔ نواب۔ نہیں۔ آیا وغیرہ۔

(۲) مرکب الفاظ۔ جب دو مفرد الفاظ مل کر ایک لفظ کا کام دیں تو اسے مرکب لفظ کہتے ہیں۔ جیسے پنگھٹ۔ عبدالعزیز۔ ناچار وغیرہ۔

مفرد الفاظ تو بحث طلب نہیں ہیں۔ جس طرح اہلِ زبان نے کوئی لفظ کسی شے کے لئے مُنہ سے نکالا یا وضع کیا وہی عام ہو گیا۔ البتہ الفاظ کو مرکب کرتے وقت چند امور احتیاط طلب ہیں۔

(۱) عربی زبان میں اَل حرف اضافت کا کام دیتا ہے۔ جس طرح اردو میں کا۔ کے اور کی آتے ہیں۔ یہ عربی اضافت ہمیشہ عربی الفاظ (مضاف اور مضاف الیہ) کے درمیان آنی چاہیئے۔ ایک لفظ فارسی اور ایک لفظ عربی یا ایک ہندی اور ایک عربی یا دونوں ہندی یا ایک ہندی اور ایک فارسی لفظ کے درمیان اَل کا استعمال ناجائز ہے۔ مثلاً صلاح الدّین ایک مرکب لفظ صلاح اور دین سے

مرکب ہوا ہے۔ اور یہ دونوں لفظ (صلاح اور دین) عربی کے ہیں۔ یہاں آل کا استعمال صحیح ہے۔ لیکن اس مرکب لفظ کی نقل کر کے چراغ الدین۔ گلاب الدین وغیرہ لکھنا بالکل غلط ہے۔ کیونکہ چراغ کی چ اور گلاب کا گ بتا رہے ہیں۔ کہ یہ دونوں فارسی لفظ ہیں۔ ان کو آل کی اضافت لگا کر دین سے مرکب نہیں کرنا چاہیئے۔ البتہ انہیں چراغ دین اور گلاب دین لکھنا اور بولنا صحیح ہے۔ اور ان میں کسرۂ اضافت لگانا جائز ہے۔ کیونکہ دین کا لفظ فارسی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور دونوں فارسی الفاظ مرکب ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح قریب المرگ۔ فوق البھڑک سراسر غلط ہیں۔ اور آل کے ایسے استعمال سے بچنا چاہیئے۔

(۲) جہاں آل کا استعمال نہ ہو لیکن دو لفظوں کو ملا کر ایک مرکب لفظ بنانا ہو وہاں بھی اس بات کا خیال رہے کہ دونوں ایک زبان میں استعمال ہونے والے الفاظ ہوں۔ ورنہ وہ مرکب خلاف قاعدہ اور غلط ہوگا۔ مثلاً لاچار میں لا عربی ہے۔ اور چارہ فارسی۔ دونوں کو ملانا ناجائز ہے۔ اس کی بجائے ناچارہ درست ہے۔ اور اسی طرح لاپروا۔ لاپتہ۔ عدم پتہ۔ لادھڑک۔ پیٹ پرست۔ پٹھان زادہ وغیرہ غلط مرکب ہیں۔ ان کی جگہ بے پروا۔ بے پتہ۔ بے دھڑک۔ پیٹو۔ افغان زادہ لکھنا اور بولنا چاہیئے۔

ممکن ہے بعض حضرات یہ کہیں کہ اردو چونکہ مختلف زبانوں کا معجون مرکب ہے۔ اس لئے اس قسم کے مرکبات بنانے میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ زبان کو اگر با اصول بنائیں تو اس کی وقعت بڑھے گی۔ ورنہ ہر کس و ناکس جس طرح چاہے گا الفاظ بناتا جائے گا۔ اور آپ اس پر بے اصولی کا الزام نہیں لگا سکتے۔

(۳) مرکب الفاظ میں اہل زبان کے روزمرّہ کی پابندی ضروری ہے۔ اور اُن کے مستعمل مرکبات پر قیاس کر کے اپنی مرضی سے ویسے مرکبات بنانا جائز نہیں۔ مثلاً سانڈنی سوار کا لفظ اہل زبان بولتے ہیں۔ اس پر قیاس کر کے ٹٹو سوار یا گدھا سوار کے الفاظ وضع کرنا درست نہیں۔ اس کی بجائے ٹٹو پر سوار آیا یا گدھے پر سوار آیا یا گدھے کا سوار آیا کہنا چاہیئے۔

اسی طرح ہمّت کا دھنی کے خیال سے زور کا دھنی یا حیا کا پتلا کے خیال سے عزّت کا پتلا وغیرہ الفاظ وضع کرنا خلاف روزمرّہ ہیں۔

پس مرکبات میں مندرجہ بالا امور کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اور اہلِ زبان کے روزمرّہ کی پابندی کرنی چاہیئے۔

اسماء کا بیان

اسم معرفہ یا اسم علم خاص نام کو کہتے ہیں۔ اور اصلی نام کے علاوہ تخلّص۔ خطاب۔ لقب۔ کنیت اور عرف اس کی قسمیں ہیں اور ان میں سے لقب کی کئی قسمیں ہیں۔

(۱) وصفی لقب۔ جو کسی خاص وصف کے سبب کسی شخص کو دیا جائے اور عام لوگ ویسا وصف پیدا نہ کر سکیں مثلاً کلیم اللہ لقب ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو اللہ تعالےٰ سے ہمکلام ہونے کی وجہ سے انہیں دیا گیا۔

(۲) نسبی لقب۔ جو خاندانی نسب سے مقرر کیا جائے مثلاً مغل قوم کے لئے مرزا۔ راجپوت و جاٹ کے لئے چودھری۔ پٹھان کے لئے خان وغیرہ کے القاب نسبی ہیں۔

(۳) رشتہ داری کے القاب۔ مثلاً بہن۔ بھائی۔ ماموں۔ چچا وغیرہ۔

(۴) تمام عہدے اور ڈگریاں مثلاً ڈپٹی کمشنر۔ منشی فاضل وغیرہ القاب میں شامل ہیں۔

فائدہ۔ جب کسی اصلی نام کے ساتھ تخلص۔ خطاب۔ لقب۔ کنیت۔ اور عرف یا ان میں سے بعض کو جمع کرنا ہو تو مندرجہ ذیل ہدایات پر کاربند ہونا ضروری ہے۔

(۱) تخلص اصلی نام کے بعد لکھتے ہیں اور لفظ صاحب جو عزت افزائی کے لئے ہوتا ہے۔ اصلی نام اور تخلص کے درمیان لکھتے ہیں۔ بعد میں لکھنا غلط ہے۔ مثلاً محمد حسین صاحب آزاد۔ الطاف حسین صاحب حالی لکھنا درست ہے۔ اور محمد حسین آزاد صاحب یا الطاف حسین حالی صاحب لکھنا غلط۔ البتہ جہاں اکیلا تخلص لکھنا ہو وہاں لفظ صاحب تخلص کے بعد لکھنا درست ہے۔ مثلاً جلیل صاحب۔ گرامی صاحب وغیرہ لیکن جہاں تخلص بطور فاعل آئے وہاں صاحب نہیں لکھتے اور اس سے پہلے اعزازی لقب لکھتے ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال فرماتے ہیں۔ مرزا غالب کہتے ہیں وغیرہ۔ یہاں صاحب لکھنا درست نہیں۔

(۲) خطاب ہمیشہ اصلی نام سے پہلے لکھتے ہیں۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں۔

(ا) انگریزی خطابات سر وغیرہ اصلی نام سے پہلے لگاتے ہیں اور کوئی لقب نسبی یا اعزازی ڈگری خطاب اور اصلی نام کے درمیان نہیں لاتے۔ بلکہ وہ خطاب سے پہلے لگاتے ہیں مثلاً چودھری سر شہاب الدین۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال وغیرہ اور انہیں سر چودھری شہاب الدین یا سر ڈاکٹر محمد اقبال لکھنا غلط ہے۔

(ب) دیسی خطابات اصلی نام سے پہلے آتے ہیں لیکن نسبی لقب بجائے

خطاب سے پہلے لکھنے کے خطاب اور اصلی نام کے درمیان لاتے ہیں۔ مثلاً خان بہادر شیخ نور الہٰی۔

(۳) لقب کو اصلی نام کے ساتھ لکھنے کے قواعد سمجھنے کے لئے یہ جان لینا ضروری ہے کہ

(۱) کنیت جو عربی میں عام طور پر استعمال ہوتی تھی۔ وہ ماں باپ یا بیٹے بیٹی کی نسبت سے ہی نہیں بلکہ بعض دیگر اوصاف کے لحاظ سے بھی کنیت بناتے اور استعمال کرتے تھے۔ اور آج بھی وہ کنیتیں مشہور ہیں مثلاً ابوتراب۔ ابوہریرہ اور ابوالہول وغیرہ ایسی کنیتیں ہیں جو اوصاف کے لحاظ سے مقرر ہوئیں۔

ابوتراب یا بوتراب کنیت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی۔ ایک دن آپ زمین پر لیٹ گئے اور جسم پر مٹی لگ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس حالت میں انہیں دیکھا اور فرمایا۔ یا بوتراب (مٹی کے باپ) اور اُس دن سے اُن کی یہ کنیت مشہور ہو گئی۔

اسی طرح عبدالرحمٰن نامی ایک جلیل القدر صحابی کو بلی پالنے کا بہت شوق تھا۔ عربی میں ایک خاص قسم کی بلی کو ہریرہ کہتے ہیں۔ جسے وہ پالتے تھے۔ اس کی نسبت سے ابوہریرہ مشہور ہوئے۔

اسی طرح وامس نامی ایک مسلمان بہادر جو صرف تیس سپاہی لے کر حلب کے قلعہ میں داخل ہوا۔ اور قلعہ کی فتح کا باعث بنا۔ اپنے ڈیل ڈول کے لحاظ سے ایسا تھا کہ اُسے دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ اور اسی وجہ سے اُسے ابوالہول کہتے تھے۔

پس ان کی دیکھا دیکھی ہمارے لوگوں نے بھی ایسی کنیتیں بنا لیں مثلاً ابوالاثر۔ ابوالکلام وغیرہ۔

لیکن اس قسم کی کنیتیں چونکہ اوصاف کے لحاظ سے وضع ہوئی ہیں اس لئے انہیں بطور لقب استعمال کیا جاتا ہے۔ اور نام سے پہلے لکھتے ہیں۔ مثلاً ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ ابوالکلام آزاد وغیرہ اور ایسی کنیت اور نام کے درمیان صاحب وغیرہ عزت افزائی کا لفظ یا کوئی اور نسبی لقب نہیں لکھتے۔ اور نہ ہی ان کے بعد لفظ صاحب استعمال ہوتا ہے۔

(۲) ایسے القاب جو قوم کی طرف سے بطور خطاب کسی کے لئے وضع کئے گئے ہوں۔ ان کو بطور وسیسی خطابات لکھتے اور بولتے ہیں۔ اور اصل نام سے پہلے لاتے ہیں۔ مثلاً ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال۔ مصورِ غم علامہ راشد الخیری۔ شاعرِ فطرت مولانا حالی وغیرہ۔ یہاں علامہ ترجمانِ حقیقت اقبال۔ علامہ مصورِ غم راشد الخیری وغیرہ لکھنا غلط ہے۔

(۳) کلیم اللہ۔ خلیل اللہ وغیرہ القاب صفات نسبتی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ اصلی ناموں کے بعد لکھنا چاہیئے۔ مثلاً حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور صاحب کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ یہاں حضرت ابراہیم صاحب خلیل اللہ لکھنا غلط ہے۔ کیونکہ جہاں بھی عزت افزائی کے لئے حضرت کا لفظ استعمال کیا جائے وہاں صاحب کا استعمال معیوب ہے +

(۴) نسبی القاب ہمیشہ نام سے پہلے آتے ہیں۔ مثلاً مرزا حمید اللہ بیگ۔ چودھری رحمت علی۔ شیخ ابراہیم۔ مستری محمد شفیع وغیرہ۔ لیکن مغربی تہذیب کے روز افزوں اثر سے آجکل اس قاعدہ کو الٹ دیا گیا ہے اور اکثر حضرات اپنے نسبی القاب اصلی نام کے بعد لکھنے لگے ہیں۔ مثلاً عابد مرزا۔ ابراہیم شیخ وغیرہ۔ اور فیشن پسند حضرات کے لئے ستائش کی بات ہے۔

مگر یاد رہے کہ ایسے حضرات اپنے لئے کوئی تخلص تجویز کریں تو نسبی القاب

کو اصلی ناموں سے پہلے لکھنا ضروری ہوگا ورنہ تخلّص مشتبہ ہو جائے گا۔ مثلاً چودھری محمد اکبر صاحب باغ تخلّص اختیار کریں اور وہ محمد اکبر چودھری باغ لکھیں تو شبہ ہوگا کہ محمد اکبر صاحب چودھری باغ کے فرزند ہیں۔ اور اگر محمد اکبر چودھری صاحب باغ لکھیں تو بالکل غلط اور غیر فصیح ہوگا بس انہیں چودھری محمد اکبر باغ لکھنا چاہیئے

(۵) رشتہ کے القاب ہمیشہ اصلی نام سے پہلے آتے ہیں۔ مثلاً بھائی مراد علی۔ بیٹی رضیہ وغیرہ۔ اصلی نام کے بعد ایسے لقب نہیں لکھتے مثلاً پیارے دوست انور لکھ کر خط شروع کریں گے۔ رشتہ کے القاب میں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ ہندی الفاظ کے ساتھ ہندی تعظیمی الفاظ استعمال کئے جائیں اور فارسی و عربی کے القاب کے ساتھ ان کے متعلقہ الفاظ۔ اور ان کا مخلوط استعمال معیوب ہے۔ مثلاً ماں کے لئے ماتا کا لفظ ہندی استعمال کیا ہے تو ماتا جی لکھیں گے۔ ماتا صاحبہ لکھنا غلط ہے۔ اور اسی طرح والدہ جی۔ بہن صاحبہ۔ ہمشیرہ جی پتا صاحب والد جی وغیرہ سب غلط ہیں۔ ان کی بجائے والدہ صاحبہ۔ بہن جی۔ ہمشیرہ صاحبہ پتا جی۔ والد صاحب لکھنا صحیح ہے۔

بھائی کے ساتھ صاحب کا لفظ عام مروّج ہے۔ لکھنا اور بولنا چاہیئے۔ پنڈت صاحب کی بجائے پنڈت جی اور مولوی جی کی بجائے مولوی صاحب صحیح ہے۔ البتہ ملّا جی بولتے ہیں۔ دادا اور نانا کے ساتھ صاحب اور جی دونو کا استعمال جائز ہے۔

آجکل خون کے رشتوں کے لئے لفظ جان کا استعمال زیادہ پسندیدہ ہے اور ابا جان۔ امی جان۔ دادا جان۔ نانا جان۔ بھائی جان۔ آپا جان وغیرہ عموماً بولتے اور لکھتے ہیں لیکن یہ صرف بڑوں کے لئے ہے۔ چھوٹوں کو مخاطب کرتے وقت جان کا استعمال ناجائز اور غلط ہے۔ مثلاً بیٹا جان۔ بیٹی جان

نہیں لکھنے۔

دوست ہمعصر ہوتا ہے۔ اور عزیز از جان ہوتا ہے۔ لیکن اسے بھی دوست جان لکھنا غلط ہے۔

(۶) عہدے اور ڈگریاں ہمیشہ ناموں کے بعد لکھتے ہیں۔ مثلاً شیخ نذیر احمد صاحب نائب تحصیلدار۔ چودھری غلام حسن صاحب گلشن بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔

لیکن ایسی ڈگریاں جو کسی یونیورسٹی کی طرف سے بطور اعزاز ملتی ہیں۔ خطاب شمار ہوتی ہیں۔ انہیں نام سے پہلے لکھنا چاہیئے۔ مثلاً ڈاکٹر سر محمد اقبال کو ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری حاصل ہوئی تھی جو بمنزلہ خطاب اُن کے نام سے پہلے لکھی جاتی ہے۔

(۷) عرف۔ جب اصلی نام کے ساتھ عرف لکھنا ہو تو لفظ عرف لکھنا ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ وضاحت ہو جائے۔ مثلاً میر سلیم جان صاحب عرف میرن بڑے وضعدار تھے۔ اس فقرہ میں میرن کا عرف واضح ہو گیا۔ اگر اسے یوں لکھتے۔ میر سلیم جان صاحب میرن بڑے وضعدار تھے۔ تو لفظ میرن پر تخلص کا گمان ہوتا۔

مصدر کا بیان

تمام مصادر کے متعلق عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ مذکر اسماء کے ساتھ آئیں یا مؤنث اسماء کے ساتھ انہیں ہمیشہ اصلی حالت میں رہنے دیا جائے مثلاً زید نے خط لکھنا چاہا۔ زید نے روٹی کھانا چاہی وغیرہ۔

لیکن جو حضرات مصدر کو اصلی حالت میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کی خدمت میں گذارش ہے کہ غالب جسے تمام اہل زبان نے بر ہمہ غالب مانا ہے۔ اور اقبال

جیسے خاتم الشعراء کہنا بجا ہے۔ ان کا کلام مطالعہ فرمائیں ۔ مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

(ملاحظہ ہو دیوان غالب)

اور علامہ اقبال ایک مولوی صاحب کی کہانی سناتے ہیں۔ ؎

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی — تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی

اور اسی زہد و رندی کی نظم میں پھر ارشاد ہے۔ ؎

سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل — مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی

(ملاحظہ ہو بانگ درا)

ان استادوں کے کلام کے بعد کیسے یہ جرأت ہے کہ اپنی نئی راہ نکالے۔ پس مصدر کو مذکر اسماء کے ساتھ مذکر اور مؤنث اسماء کے ساتھ مؤنث استعمال کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مصدر در اصل فعل کا نام ہے۔ اور فعل کی تذکیر و تانیث اردو میں اسماء کے ساتھ وابستہ ہے۔ یعنی مذکر اسم کا فعل مذکر اور مؤنث اسم کا فعل مؤنث لکھتے ہیں۔ تو مصدر کی حالت کو تبدیل کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ اور ویسے بھی روٹی کھانا پڑی چٹھی لکھنا چاہی وغیرہ فقرے غیر مانوس ہیں۔ ان سے پرہیز واجب ہے۔

ضمائر کا بیان

(۱) جب کسی فعل ناقص کے ساتھ کوئی مصدر مذکر یا مؤنث صورت میں آئے تو نے علامت فاعل کی جگہ کو علامت مفعول لکھتے ہیں۔ یا ضمیر فاعلی کو ضمیر مفعولی سے بدل دیتے ہیں۔

مثلاً زید نے لاہور جانا تھا۔ کی بجائے زید کو لاہور جانا تھا۔

تم نے کیا لکھنا ہے کی بجائے تمہیں کیا لکھنا ہے۔

اُس نے روٹی کھانی تھی۔ کی بجائے اسے روٹی کھانی تھی۔

لکھینگے

(۲) جب کوئی مصدر چاہنا۔ پسند کرنا۔ سیکھنا۔ حاصل کرنا۔ دیکھنا۔ شروع کرنا۔ مصادر کے افعال کے ساتھ آئے تو متعدی افعال کی طرح ان کے ماضی مطلق ماضی قریب۔ ماضی بعید اور ماضی شکیہ کے افعال میں نے علامت فاعل لکھتے ہیں اور اسے مفعولی علامت سے نہیں بدلتے۔ مثلاً بشیر نے گھر جانا چاہا۔ اختر نے سکول ماسٹر بننا پسند کیا ہے۔ میں نے تیرنا سیکھا تھا۔ تم نے طیاروں کا اڑنا دیکھا ہوگا۔ لومڑی نے بھاگنا شروع کیا۔

(۳) پڑنا مصدر کے افعال کے ساتھ جب کوئی مصدر آئے تو ہمیشہ نے علامت فاعل کی بجائے کو لکھتے ہیں۔ مثلاً محمود کو ملتان جانا پڑا تھا۔ اب اسے یہاں رہنا پڑے گا۔

لیکن جب کبھی ایسے فقروں میں مفعول اور اس کے ساتھ کو علامت مفعول ہو تو دقت واقع ہوتی ہے۔ مثلاً جلدی کے سبب اسلم کو تانگے والے کو زیادہ پیسے دینے پڑے۔

یہاں فاعل اور مفعول دونو کے ساتھ کو علامت لگی ہوئی ہے جس سے فقرہ بھدا ہو گیا ہے۔ اور مفعول کی پہچان مشکل ہو گئی ہے۔ کہ پیسے دینے والا اسلم ہے۔ یا تانگے والا۔ اور مفعول کون ہے۔ پس ایسی صورت میں فقرے کی شکل بدل دینی چاہئے مندرجہ بالا فقرہ اس طرح لکھا جا سکتا ہے۔

(۱) جلدی کے سبب اسلم مجبور تھا کہ تانگے والے کو زیادہ پیسے دیئے۔

(۲) جلدی کے سبب اسلم نے تانگے والے کو زیادہ پیسے دیئے۔

(۳) جلدی کے سبب اسلم کو تانگے کا کرایہ زیادہ دینا پڑا۔

یا مثلاً بشیر کو نذیر کو خط لکھنا پڑا کی بجائے بشیر کو نذیر کی طرف خط لکھنا پڑا۔ زید کو حامد کو دام دینے پڑے کی بجائے زید کو حامد کے دام دینے پڑے۔ لکھنا چاہئے۔

(۴) کو علامت مفعول والی ضمیروں کی بجائے دوسری مفعولی ضمیر استعمال کرنا زیادہ فصیح ہے۔ مثلاً

ہم کو	مجھ کو	تم کو	تجھ کو	اُن کو	اس کو
کی بجائے	کی بجائے	کی بجائے	کی بجائے	کی بجائے	کی بجائے
ہمیں	مجھے	تمہیں	تجھے	انہیں	اسے

(۵) جب کسی فقرے میں فاعل اور مفعول دونوں کی جگہ مفعولی ضمیریں استعمال کرنی ضروری ہوں تو ایک جگہ کو علامت ضمیر مفعولی لگانی چاہیئے۔ مثلاً اسے تمہیں کتاب دینی چاہیئے۔ کی بجائے اس کو تمہیں کتاب دینی چاہیئے لکھنا درست ہے۔ یا مثلاً مجھے انہیں بلانا منظور تھا۔ کی بجائے مجھ کو انہیں بلانا منظور تھا۔ یا مجھے اُن کو بلانا منظور تھا لکھنا جائز اور درست ہے۔

(۶) بندہ۔ فدوی۔ خاکسار۔ نیازمند وغیرہ الفاظ واحد متکلم کی ضمیر کے لئے اور جناب۔ حضور۔ آپ۔ اعلیحضرت وغیرہ الفاظ ضمیر جمع حاضر کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

جمع حاضر کے صیغے میں تو ان ضمائر کے افعال بھی جمع آتے ہیں۔ مثلاً حضور سچ فرماتے ہیں۔ جناب اپنے غلاموں کی پرورش کرتے ہیں وغیرہ فقروں میں افعال صیغہ جمع حاضر استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن واحد متکلم کی ان ضمیروں کے لئے فعل کا صیغہ واحد غائب آیا کرتا ہے۔

بعض اردو نویس حضرات نے فارسی کی تقلید کر کے ان ضمیروں کے لئے فعل کا صیغہ واحد متکلم استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ مثلاً فارسی میں کہتے اور لکھتے ہیں۔ بندہ شرمسارم۔ نیازمند ایں [illegible] کردہ ام۔ فدوی جاں نثار خواہم کرد اور ان کی تقلید میں ہمارے یہ حضرات لکھتے ہیں۔ بندہ شرمسار ہوں

فدوی جان قربان کروں گا وغیرہ - اور یہ غلط ہے - کیونکہ انکساری اور تواضع کے لئے جب یہ ضمیریں آتی ہیں تو متکلم اپنی ذات کی نفی کرتا ہے - اور بظاہر غیر ذات کا ذکر کرتا معلوم ہوتا ہے - لیکن مقصود اس کی اپنی ذات ہوتی ہے مثلاً مرزا غالب ایک عریضہ منظوم میں بادشاہ سے عرض کرتے ہیں - ؎

آپ کا بندہ اور پھرے ننگا　　آپ کا نوکر اور کھائے اُدھار

یہاں آپ کا بندہ اور آپ کا نوکر سے مراد غالب کی اپنی ذات ہے - لیکن انہوں نے فعل متکلم پھروں اور کھاؤں استعمال نہیں کئے -

پس بندہ شرمسار ہے - فدوی جان قربان کرے گا وغیرہ لکھنا چاہئے -

(۷) ضمیر اشارہ - اشارہ کو اپنے مشارٌ الیہ سے جدا نہیں کرنا چاہئے - اور مرکب اضافی میں جہاں مضاف الیہ کا ذکر مطلوب ہو وہاں مضاف الیہ کے ساتھ اور جہاں مضاف کی وضاحت کرنا ہو وہاں مضاف کے ساتھ اشارہ کی ضمیریں لگاؤ - ورنہ مطلب صحیح نہ رہے گا - مثلاً

سکول کے لڑکے کو انعام ملا تھا - اگر ہم سکول کا ذکر کرنا چاہیں تو کہیں گے اس سکول کے لڑکے کو انعام ملا تھا - اور اگر لڑکے کا ذکر مطلوب ہو تو کہیں گے سکول کے اس لڑکے کو انعام ملا تھا -

صفت کا بیان

(۱) صفت مفرد ہو یا مرکب - اُردو میں ہمیشہ اپنے موصوف سے پہلے آتی ہے - جیسے نیک لڑکا - خوبصورت مکان - بمبئی چادر - ملتانی مٹی - چاروں طرف وغیرہ -

البتہ جہاں صفت بطور خبر واقع ہو وہاں اسم کے بعد لکھتے ہیں مثلاً لڑکا نیک ہے - مکان خوبصور[illegible] ہے - یا جہاں صفت نسبتی کسی اسم علم کے ساتھ واقع ہو - اسے بعد میں لکھتے ہیں مثلاً انیس لکھنوی حفیظ جالندھری -

(۲) صفت نسبتی بنانے کے لئے عموماً کسی اسم کے بعد ی لگاتے ہیں۔ مثلاً لاہوری، سیالکوٹی، پاکستانی وغیرہ۔ اور کبھی ی لگاتے وقت اسم میں کچھ تبدیلی کرتے ہیں۔ جیسے رَے سے رازی۔ ہرات سے ہروی۔

لیکن اس سلسلے میں جو ایک خاص دِقّت واقع ہوتی ہے۔ اس کا ذکر عموماً گرامر کی کتابوں میں بالتفصیل درج نہیں۔ اس لئے اردو نویس حضرات پریشان ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ بعض اسماء کے آخر میں ی لگا نہیں سکتے مثلاً بمبئی۔ کراچی کے آخر میں ی نہیں لگ سکتی اور بعض جگہ ی لگانے سے مطلب اُلٹ پُلٹ ہو جاتا ہے۔ اور بجائے صفت نسبتی کے صفت ذاتی کا گمان ہوتا ہے۔ مثلاً علی محمد صاحب سوت کی دُکان کرتے ہیں۔ اگر انہیں علی محمد سوتی کہیں تو اصل مطلب فوت ہو گیا۔ اور گمان ہو سکتا ہے کہ علی محمد صاحب بھی شاید سوت کے بنے ہُوئے ہیں۔ نیز بعض شہروں کے نام اس قسم کے ہیں جہاں ی لگانے سے لفظ پھُسپھُسا ہوتا ہے۔ مثلاً گوجرانوالہ سے گوجرانوالوی کہیں تو ناگوار سا معلوم ہوتا ہے۔

پس ایسی تمام صورتوں میں بجائے ی لگانے کے والا یا والے لگا کر صفت نسبتی بناتے ہیں۔ مثلاً ہارون بھائی کراچی والے۔ جمشید جی بمبئی والے۔ اصغر علی عطر والا وغیرہ۔

عام اصحاب اس قاعدہ سے ناواقفیت کے سبب کھُڈیاں سے کھُڈیالوی کاہنہ نو سے کاہنہ نوی۔ رائے ونڈ سے رائے ونڈوی۔ رُکھانوالہ سے رُکھانوالوی وغیرہ لکھتے ہیں۔ لیکن پتوکی اور کوٹ کپتان شیر سنگھ کے مقاموں پر پہنچ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ ان اور ایسے تمام اسماء کے لئے والا یا والے لگانا چاہیئے۔

(۳) دونوں صفت عددی ہے۔ اصل املا دونوں چاہیئے۔ دونو لکھنا غلط

ہے۔ اور دونوں۔ تینوں۔ چاروں وغیرہ صحیح۔

وحدت و جمع اگرچہ جاندار و بے جان اشیاء کی جمع بنانے کے قواعد گرامر کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ لیکن بعض ایسی باتیں ہیں جن کو شرح و بسط سے بیان نہیں کیا گیا۔ اور طلباء اور بعض دیگر اردو نویس حضرات ان کے لکھنے میں غلطی کھا جاتے ہیں۔ یہاں صرف وہی باتیں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) عام قاعدہ ہے کہ اگر مذکر اسماء کا آخری حرف الف یا ہائے مختفی ہو۔ تو جمع بناتے وقت اسے یائے مجہول سے بدل دیتے ہیں۔ مثلاً لڑکا آیا۔ لڑکے آئے۔ نقشہ پھٹ گیا۔ نقشے پھٹ گئے وغیرہ۔ لیکن یاد رہے کہ ایسے اسماء کے بعد جب حروف مغیرہ آئیں تو حالت واحد میں بھی ان کا الف یا ہائے مختفی یائے مجہول سے بدل جاتا ہے۔ مثلاً لڑکے نے کتاب پڑھی۔ نقشے پر دیکھو۔ دیوانے کو نہ چھیڑو۔ پروانے سے جلنا سیکھو وغیرہ۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ عام اصحاب نقشہ پر دیکھو۔ دیوانہ کو نہ چھیڑو وغیرہ لکھتے ہیں۔ اور یہ غلط ہے۔

نوٹ:۔ ا۔ حروف مغیرہ یہ ہیں:۔ میں۔ سے۔ کو۔ تک۔ پر۔ کا۔ کے۔ کی۔ نے۔ والا۔

ب۔ بعض بے جان مذکر اسماء کے آخر میں حروف مغیرہ آئیں تو ان کا آخری حرف الف یا ہائے مختفی یائے مجہول سے نہیں بدلتا۔ مثلاً دریا نے بہنا شروع کیا۔ ہمالہ پر ہمیشہ برف جمی رہتی ہے۔

گویا دریا اور ہمالہ قاعدہ مذکورہ سے مستثنےٰ ہیں۔

ج۔ تمام اسمائے فاعل جن کے آخر میں الف آئے اور تمام وہ الفاظ جن کے آخر میں ہائے ملفوظی ہو۔ جب ان کے ساتھ حروف مغیرہ آئیں تو حالت واحد میں اُن کے الف

اور ہائے کو یائے مجہول سے نہیں بدلتے۔ مثلاً دانا نے جواب دیا۔ گناہ سے بچو وغیرہ۔

د۔ تمام مؤنث اسماء بھی اس قاعدے سے مستثنےٰ ہیں۔ مثلاً مینا نے شکاری کو دیکھا فاختہ کو نہ مار۔ بیوہ نے آہ بھری۔ ٹھلیا میں پانی نہیں۔

س۔ تمام اسمائے علم بھی اس قاعدہ سے مستثنےٰ ہیں۔ مثلاً زبیدہ نے نہر بنوائی۔ مرزا نے خط لکھا۔ مکّہ سے مدینہ تک ریل چلنے لگے گی وغیرہ۔

(۲) مؤنث اسماء کی جمع کے مختلف قاعدے گرامر کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ لیکن بعض حضرات نادانی سے ان پر عمل نہیں کرتے۔ مَیں نے ایک ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر کو دیکھا وہ آرڈر دیا کرتے تھے۔ چار پائیں مرمت کرانی ہیں۔ کرسیں بھی باہر نکالو وغیرہ۔

گویا انہیں معلوم نہ تھا کہ جن اسمائے مؤنث کے آخر میں یائے معروف ہو اور حروف مغیرہ اُن کے ساتھ نہ آئیں تو اُن کی جمع بناتے وقت اں زیادہ کرتے ہیں۔ اور انہیں چارپایاں اور کرسیاں لکھنا چاہیئے۔ وہ سلیٹ سے سلیٹیں اور میز سے میزیں بننے پر قیاس کر کے یہ غلطی کھاتے تھے۔ پس ان قواعد کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

(۳) صفات جب موصوف اسموں کے ساتھ آئیں تو اُن کی جمع نہیں بناتے۔ خواہ وہ بطور خبر ہی واقع ہوں۔ مثلاً نیک لڑکا۔ نیک لڑکے۔ وفادار نوکر۔ خوبصورت کھلونا۔ خوبصورت کھلونے۔ دیوار مضبوط ہے۔ دیواریں مضبوط ہیں وغیرہ۔

البتہ جب کسی صفت کا آخری حرف الف یا ہائے مختفی ہو تو جمع کی حالت میں اسے یائے مجہول سے بدل دیتے ہیں۔ جیسا کہ قاعدہ ع۱ میں بیان ہوا ہے مثلاً اچھا لڑکا۔ اچھے لڑکے۔ گندہ کپڑا۔ گندے کپڑے وغیرہ۔

نوٹ:۔ صفت جب موصوف کے مقام ہو یا الگ آئے تو اس کی وحدت و جمع عام اسموں کی طرح ہوتی ہے۔

(۴) کوئی اور کسی کے الفاظ واحد اسموں کے ساتھ اور بعض کئی چند جمع اسموں کے ساتھ آیا کرتے ہیں۔ مثلاً

کوئی لڑکا باغ میں نہ تھا۔ کسی نوکر نے شرارت کی ہوگی۔ بعض لڑکے میلے رہتے ہیں۔ کئی باتیں یاد نہیں ہیں وغیرہ۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ طلباء کوئی کا لفظ خاص طور پر غلط استعمال کرتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں۔ کوئی لڑکے وہاں نہ تھے۔ کوئی دواتیں پسند نہ آئیں وغیرہ یہ فاش غلطی ہے۔ اس سے بچنا چاہیئے اور لکھنا چاہیئے۔ کوئی لڑکا وہاں نہ تھا۔ کوئی دوات پسند نہ آئی۔

(۵) لوگ ہمیشہ جمع کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے مقابل میں واحد نہیں آتا۔ گویا یہ اسم جمع ہے۔ اور اس کی جمع لوگوں بناتے ہیں۔ مثلاً لوگ تماشا دیکھنے آئے لوگوں نے آگ لگا دی۔ کوئی لوگ یا کسی لوگ لکھنا قطعاً غلط ہے۔

(۶) افعال کی وحدت و جمع غائب۔ حاضر اور متکلم کے واحد اور جمع کے صیغوں کے لحاظ سے ہوتی ہے جس کا بیان گرامر کی کتابوں میں مذکور ہے۔ یہاں طلباء کی آگاہی کے لئے صرف یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ مؤنث فعلوں میں جب علامتِ فعل ہے۔ تھا یا ہوگا کے مؤنث صیغے ہوں یا کوئی امدادی فعل لگا ہو تو جمع بناتے وقت اصلی فعل واحد حالت میں رہتا ہے اور علامت یا امدادی فعل کی جمع بناتے ہیں۔ مثلاً

واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر
وہ کھاتی ہے	وہ کھاتی ہیں	تو کھاتی ہے
یا وہ آئی ہوگی	وہ آئی ہوں گی	تو آئی ہوگی
جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
تم کھاتی ہو	میں کھاتی ہوں	ہم کھاتی ہیں
یا تم آئی ہوگی	میں آئی ہوں گی	ہم آئی ہوں گی

بعض طلباء نادانی سے لکھتے ہیں۔ بھیڑیں چرتیں ہیں۔ ہم نے کرسیاں خریدیں تھیں۔ ایسے فقرے غلط ہوتے ہیں۔ بھیڑیں چرتی ہیں۔ ہم نے کرسیاں خریدی تھیں لکھنا چاہیئے ؛

تذکیر و تانیث

جاندار و بے جان اسموں کی تذکیر و تانیث کا بیان گرامر کی کتابوں میں مفصّل لکھا ہُوا ہے لیکن اکثر مصنّفین نے بے جان اشیاء یا الفاظ کا ذکر کرتے ہُوئے بہت سے الفاظ نظر انداز کر دیئے ہیں۔ اور ان کے مذکر و مؤنث استعمال کرنے کے قواعد بھی نہیں لکھے۔ یہاں وہ الفاظ و قواعد درج کئے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ پنجابی میں جن الفاظ کو مذکر بولا جاتا ہے۔ عام پڑھے لکھے لوگ غلطی سے اردو میں بھی انہیں مذکر بولتے ہیں۔ اور اسی طرح پنجابی میں جنہیں مؤنث بولا جاتا ہے۔ اردو میں بھی انہیں مؤنث بولتے ہیں۔ ایسے اشخاص کو لازم ہے کہ اردو قواعد کا خیال رکھیں۔ اور الفاظ کو صحیح استعمال کریں۔

(۱) الفاظ ذیل مذکر بولے جاتے ہیں:۔

اخبار۔ آبشار۔ آغوش۔ تار۔ ٹکٹ۔ جھاگ۔ حلف۔ خواب۔ درد۔ دہی۔ زہر۔ سونڈ۔ طرز۔ غار۔ غش۔ قلم (لکھنے والا) کھیل۔ گوند۔ مرہم۔ مرض۔ میل۔ متاع۔ موڑ۔ منشا۔ نشتر۔ نقاب۔ ہوش۔ وعظ۔ مزاج

(۲) مندرجہ ذیل الفاظ مؤنث بولے جاتے ہیں:۔

اردو۔ بس۔ بھڑ۔ بائیسکل۔ تپ۔ جنگ۔ جانماز۔ ڈکار۔ رُوح۔ راہ۔ سانس۔ فکر۔ قلم (شاخ کی) کیچڑ۔ کیل۔ گیند۔ گھاس۔

باقی الفاظ کی تذکیر و تانیث کے متعلق پنجاب اور یو۔پی کے حضرات متفق ہوں گے۔ لیکن موٹر اور متاع کے مذکر استعمال کرنے کو یو۔پی کے لوگ شائد ناجائز خیال کریں۔ اس لئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ علاّمہ اقبال مرحوم نے ان دونوں لفظوں کو مذکر استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

(۱) کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی ۔۔۔ موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش

(۲) وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا ۔۔۔ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

(بانگِ درا)

اور اتمام حجت کے لئے یہ ثبوت کافی ہے۔ کیونکہ کسی زبان کے اُستاد کسی لفظ کو جس طرح استعمال کرتے ہیں وہ باقی اہل زبان لوگوں کے لئے سند ہو جاتا ہے مثلاً کافر کا لفظ ف کے کسرہ سے لکھتے ہیں۔ اور فاعل کے وزن پر اسی طرح بولنا جائز ہے۔ مگر اردو کے اساتذہ نے اسے سَر۔ بَر۔ زَر۔ دَر وغیرہ قافیوں کے ساتھ باندھا ہے۔ اور اب بھی جائز ہے۔ ملاحظہ ہو ذوق کی ایک غزل جس کا مطلع ہے :۔

مطلع ؎
ہے تیرے کان زلف معنبر لگی ہوئی
ہٹتی نہیں ہے بال برابر لگی ہوئی

اور مقطع ہے ؎
اے ذوق دیکھ دختر رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اسی طرح سانس کے مؤنث ہونے پر شاید پنجابی حضرات معترض ہوں پس وہ بھی اُستاد ذوق کا یہ شعر دیکھیں۔ ؎

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینے میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

۵۔ سانس دیکھی تن بسمل میں جو آتے جاتے
اور چھری کا دیا صیاد نے جاتے جاتے

(۳) مشترک الفاظ اپنے معنوں کے لحاظ سے مذکر و مؤنث بولے جاتے ہیں مثلاً

آب (پانی) مذکر } عرض (چوڑائی) مذکر } لگن (برتن) مذکر }
آب (چمک) مؤنث } عرض (التماس) مؤنث } لگن (محبت) مؤنث }

بار (بوجھ۔پھل) مذکر }
بار (باری) مؤنث } علیٰ ہٰذا القیاس

(۴) بعض الفاظ جو جاندار اسموں کے ساتھ بطور صفت یا خبر واقع ہوتے ہیں۔ مذکر اور مؤنث اسموں کے ساتھ یکساں بولے جاتے ہیں اور ان کی تذکیر و تانیث نہیں ہوتی مثلاً دوست۔ دشمن۔ وفادار۔ مہربان وغیرہ۔ صرف حرفِ اضافت کا استعمال ان کے مذکر و مؤنث ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ مثلاً خالدہ اپنے بھائی کی دشمن تھی۔ اکبر چاند بی بی کا دوست نہ تھا وغیرہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بعض کم فہم حضرات ایسے الفاظ کی تذکیر و تانیث کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک جگہ چند حضرات کو دیکھا۔ مذکر کے ساتھ جناب استعمال کرنا اور مؤنث کے لئے جنابہ استعمال کرنا زیرِ بحث لائے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جناب والد صاحب۔ اور جنابہ ہمشیرہ صاحبہ لکھنا چاہئیے میں حیران ہؤا اور انہیں مشکل سے یہ سمجھایا۔ کہ عزت افزائی کے الفاظ اور صفات تمام مذکر اور مؤنث اسموں کے ساتھ یکساں استعمال ہوتے ہیں۔ اور ان میں تذکیر و تانیث نہیں ہوتی۔ صرف وہ الفاظ جن کا آخری حرف الف یا ہائے مختفی ہو۔ اور بطور ہندی صفت واقع ہوں۔ مؤنث اسموں کے ساتھ آئیں تو اُن کے الف اور ہائے مختفی یائے معروف سے بدل جاتے ہیں۔ مثلاً اچھا لڑکا۔

اچھی لڑکی۔ گندہ پانی۔ گندی نالی وغیرہ۔ باقی صفات کی حالت نہیں بدلتی مثلاً وفادار نوکر۔ وفادار بیوی۔ نیک اُستاد۔ نیک اُستانی وغیرہ۔

مذکر و مؤنث الفاظ کے استعمال کے قواعد

(۱) ایسی صفات تلاش کرو جن کے آخر میں الف یا ہائے مختفی ہو۔ پھر جس لفظ کو مذکر بیان کرنا ہو۔ اسے اس کے ساتھ اسی طرح لگا دو اور جس لفظ کو مؤنث استعمال کرنا ہو اس صفت کے الف یا ہائے مختفی کو یائے معروف سے بدل دو مثلاً "تار" کو مذکر استعمال کرنا ہے اور جنگ کو مؤنث۔ ان کے لئے لمبا کا لفظ لیتے ہیں۔ اور یوں استعمال کرتے ہیں :۔

(۱) سنار نے سونے کا بہت لمبا تار کھینچا۔ (یا)

(۲) یہ تار بہت لمبا ہے۔

ان دونوں فقروں میں تار کا مذکر ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

اب دیکھئے (۱) یہ جنگ لمبی ہو رہی ہے۔ (۲) یورپ کی تیس سالہ لمبی جنگ خطرناک تھی۔ ان فقروں میں جنگ کا مؤنث ہونا ظاہر ہو رہا ہے۔

اسی طرح گندا پانی۔ گندی نالی۔ چھوٹا لڑکا۔ چھوٹی لڑکی۔ ہرا درخت۔ ہری گھاس وغیرہ میں صفتوں کی تذکیر و تانیث سے اسماء کی تذکیر و تانیث واضح ہوتی ہے۔

(۲) جس لفظ کو استعمال کرنا ہو اُسے مضاف بنا دو اور اگر مذکر ہے۔ تو کا یا کے حرفِ اضافت اور اگر مؤنث ہے تو کی حرفِ اضافت اس سے پہلے لگاؤ۔ تذکیر و تانیث واضح ہو جائے گی۔ مثلاً کیکر کا گوند لاؤ۔ یہاں گوند مذکر استعمال ہوا ہے۔ یہ ربڑ کی گیند ہے۔ یہاں گیند مؤنث استعمال ہوئی ہے۔

(۳) جس لفظ کو استعمال کرنا ہو اُسے بطور فاعل استعمال کرو اور مذکر ظاہر کرنے کے لئے فعل مذکر اور مؤنث ظاہر کرنے کے لئے فعل مؤنث اس کے ساتھ لگاؤ۔

مثلاً ع - مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی (مرض مذکر ظاہر ہوتا ہے)

ع - دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے - (درد مذکر استعمال ہوا ہے)

ع - گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے - (تپ مؤنث ہے)

ع - مجھے شرمندہ کرنے کی نئی اک راہ پیدا کی (راہ مؤنث ہے)

(۴) افعال کی تانیث میں جمع متکلم کا صیغہ آجکل مذکر استعمال ہونے لگا ہے۔ مثلاً عورتیں کھانا کھاتے وقت کہہ دیتی ہیں "ہم کھاتے ہیں"۔ اور اسی طرح تمام افعال میں ہم دیکھتے ہیں۔ ہم جاتے ہیں وغیرہ - مذکر کے صیغے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور یہ شاید اس لئے ہے کہ عورتیں مردوں کی برابری کا دعویٰ کرنے لگی ہیں۔ لیکن میں اسے معیوب سمجھتا ہوں۔ عورتوں کے لئے مؤنث صیغے استعمال ہونے چاہئیں۔ ورنہ زباندانی میں ان کی امتیازی حیثیت مٹ جائے گی۔ اور باقی صیغوں میں بھی انہیں مردوں کی طرح خطاب کرنا شروع کر دیا جائے گا جس سے عورت و مرد کی تمیز نہیں ہو سکے گی۔

اس میں شک نہیں کہ واحد عورت کلام کرتے وقت شاہانہ انداز سے کہہ سکتی ہے۔ کہ "ہم حکم دیتے ہیں۔ ایسا کرو"۔ اس صورت میں ہر واحد متکلم کے لئے جمع کا صیغہ جائز ہوتا ہے۔ جیسا کہ تمام بڑے بڑے عہدیدار اپنی تقریروں یا فیصلوں میں لکھتے ہیں۔ لیکن ہر جگہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

حروف کا استعمال

(۱) دو حروف مغیرہ یا حروف جار اکٹھے نہیں کہنے چاہئیں۔ مثلاً ڈھیر میں سے چند دانے اٹھاؤ۔ کوٹھے پر سے اترا۔ آپ کے سے کئی آدمی مَیں نے دیکھے ہیں۔ وغیرہ یہ تمام فقرے غلط ہیں۔ انہیں یوں لکھنا چاہیئے۔ ڈھیر سے چند دانے اٹھاؤ۔ کوٹھے سے اُترا۔ آپ ایسے کئی آدمی مَیں نے دیکھے ہیں۔

(۲) اگر حرفِ شرط پہلے فقرے میں اور تو حرفِ جزا اس کے ساتھ دوسرے فقرے میں لکھنے ہیں۔ مثلاً اگر تم کہو گے تو مَیں جاؤں گا۔ بعض دفعہ حرفِ شرط یا حرفِ جزاء حذف کر دیتے ہیں۔ اور اس سے فقرہ زیادہ شاندار بنتا ہے۔ اس لئے کسی ایک حرف کو حذف کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مثلاً لاہور جاؤ تو میری کتاب لیتے آنا۔ آپ کہتے ہیں تو مَیں خط لکھ دیتا ہوں۔ مَیں آؤں گا تو تمہیں سبق یاد کراؤں گا۔

ان تمام فقروں میں حرفِ شرط (اگر۔ جب) پہلے فقروں سے حذف کئے گئے ہیں۔ اور فقرے خوبصورت ہیں۔ جب مَیں گیا۔ وہاں کوئی آدمی نہ تھا۔ اگر آپ آجاتے۔ مَیں ہرگز نہ جاتا۔

ان فقروں میں تو حرفِ جزاء محذوف ہے۔ لیکن عموماً حرفِ شرط کا حذف کرنا زیادہ فصیح ہے۔ چنانچہ اُوپر کے دو فقروں میں جہاں حرفِ جزاء محذوف کیا گیا ہے۔ حرفِ شرط کو حذف کریں تو فقرے یوں بن جاتے ہیں۔ مَیں گیا تو وہاں کوئی آدمی نہ تھا۔ آپ آجاتے تو مَیں ہرگز نہ جاتا۔ اور یہ زیادہ موزوں ہیں۔

(۳) چونکہ ہمیشہ پہلے فقرے میں اور اس لئے دُوسرے فقرے میں

استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً چونکہ سلیم بیمار تھا اس لئے وہ برات میں شامل نہ ہو سکا۔
چونکہ اس نے چوری کی تھی۔ اس لئے وہ پکڑا گیا وغیرہ۔

ایسے فقروں میں چونکہ کا حذف کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا فقروں کو یوں لکھتے ہیں:۔

سلیم بیمار تھا اس لئے وہ برات میں شامل نہ ہو سکا۔ اس نے چوری کی تھی۔ اس لئے پکڑا گیا۔

نوٹ:۔ ایسے فقروں میں اس لئے کے بعد پہلے فقرے کے فاعل کی خاطر ضمیر وہ ضرور لکھنی چاہیئے۔ ورنہ فقرہ صحیح معنے نہ دے گا۔

(۴) گو۔ اگرچہ اور ہر چند پہلے فقروں میں اور پر۔ مگر لیکن دوسرے فقروں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً

گو اسلم ذہین تھا مگر محنت نہ کرنے کے سبب فیل ہو گیا۔

اگرچہ وہ قاتل نہیں لیکن قاتل کا معاون تو ہے۔

ہر چند لوگوں نے سمجھایا پر وہ باز نہ آیا۔

(۵) کیونکہ حرفِ علت ہے۔ اسے ہمیشہ پہلے فقرے کا سبب بیان کرنے کے لئے دوسرے فقرے میں استعمال کرتے ہیں۔ کسی حالت میں اسے پہلے فقرے میں نہیں لانا چاہیئے۔ مثلاً زید لسی نہیں پیئے گا۔ کیونکہ اُسے کھانسی آتی ہے۔

(۶) نہ۔ نہیں اور مت حروفِ نفی ہیں۔ ان میں سے مت اور نہ فعل نہی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً نہ جا۔ مت لڑ۔ مت بیٹھو۔ نہ کھاؤ۔ نہ کہو۔ مت کہو وغیرہ۔

اور مت خصوصاً فعل نہی کے لئے آتا ہے۔ باقی افعال کی نفی کرتے وقت

مت استعمال نہیں کرتے اور نہ و نہیں لگا کر افعال کی نفی کرتے ہیں۔

فائدہ۔ فعل ماضی قریب و ماضی بعید اور فعل حال کی نفی کرتے وقت ہمیشہ نہیں استعمال کرتے ہیں۔ نہ نہیں لگاتے۔ مثلاً تو نے نہیں دیکھا ہے۔ وہ نہیں جاتے ہیں۔ میں نے نہیں سُنا تھا۔ یہاں نہ دیکھا ہے۔ نہ جاتے ہیں۔ نہ سُنا تھا لکھیں تو غلط ہے۔ البتہ جب کبھی تاکید اور زور پیدا کرنے کے لئے ان فعلوں کی نفی کی جائے۔ تو نہ کا حرف فعل سے الگ کر کے پہلے لاتے ہیں۔ مثلاً ایسا جانور نہ کسی نے دیکھا ہے۔ نہ سُنا ہے۔ نہ ہم جاتے ہیں۔ نہ وہ آتے ہیں۔ مگر یہ صورت اکیلے فقرے میں نہیں ہوتی وہاں نہیں لگانا چاہیئے۔

فعل ماضی تمنائی اور فعل مضارع کی نفی ہمیشہ نہ لگا کر کی جاتی ہے۔ نہیں اور مت کا استعمال ناجائز ہے۔ اگر تو نہ آتا تو ہم نہ جاتے۔ زید وہاں نہ جاتا تو یہ مصیبت نہ پڑتی وغیرہ ماضی تمنائی اور وہ نہ جائے۔ تو نہ کھائے۔ ہم نہ جائیں وغیرہ۔ فعل مضارع کی مثالیں واضح ہیں۔

باقی افعال کی نفی نہ اور نہیں دونوں حرفوں سے کی جاتی ہے۔ مثلاً وہ نہ گیا ہوگا یا وہ نہیں گیا ہوگا۔ تم نہ جاتے تھے یا نہیں جاتے تھے۔ میں نہ جاؤں گا یا نہیں جاؤں گا وغیرہ۔ البتہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جس جگہ فیصلہ کے طور پر کسی فعل کی نفی کی جائے۔ وہاں نہیں لگانا چاہیئے۔ نہ لگانے کی صورت میں کچھ شک سا رہ جاتا ہے۔ اور یقین کے ساتھ انکار نہیں کیا جاتا۔ مثلاً زید کراچی نہ جائیگا اور زید کراچی نہیں جائے گا۔ فقروں میں دوسرا فقرہ نہ جانے کا یقین دلاتا ہے۔ اور پہلا فقرہ انکار کا یقین نہیں دلاتا۔ جہاں نہ لگا کر فعل کی نفی کلیتہً مقصود ہو۔ وہاں نہ ہرگز لگا دیتے ہیں۔ اور یاد رہے کہ جہاں ہرگز کا استعمال ہو۔ وہاں ہمیشہ نہ لگاتے ہیں۔ مثلاً وہ ہرگز نہ جائے گا۔

محاورات اور ضرب الامثال

محاورات اور ضرب الامثال کے استعمال میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ اُن کے مجازی معنے واضح ہو جائیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو استعمال غلط ہے۔ مثلاً باغ باغ ہونا محاورہ ہے۔ جس کے مجازی معنے خوش ہونا کے ہیں۔ اب کوئی طالب علم اگر اسے اس طرح استعمال کرے کہ اسلم زید کو دیکھ کر باغ باغ ہو گیا تو صحیح نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کوئی شخص جو محاورہ کے معنوں سے ناواقف ہے۔ وہ یہ سمجھ لے کہ اسلم نے جب زید کو دیکھا تو راستہ چھوڑ کر باغ کو ہو گیا یا مثلاً اوس پڑنا محاورہ ہے۔ جس کے معنی بے رونق ہونا کے ہیں۔ اور کوئی اسے یوں استعمال کرے کہ موسم خزاں میں پھولوں پر اوس پڑ گئی تو ممکن ہے۔ محاورہ کے معنوں سے ناواقف شخص اس سے شبنم کا پڑنا مراد لے۔

پس جاننا چاہیئے کہ جب محاورہ کسی فقرے میں استعمال کرنا ہو تو

(۱) اس فقرے میں کوئی ایسا لفظ لانا چاہیئے جو محاورے کے معنوں کو واضح کر دے۔

(۲) محاورے کے معنوں کے مترادف یا متضاد ایک اور فقرہ اس فقرے سے پہلے لگانا چاہیئے۔ مثلاً اوپر کے محاوروں کو اس طرح استعمال کرنا چاہیئے:۔

باغ باغ ہونا۔ (۱) ماں اپنے بچھڑے ہوئے بچے سے مل کر باغ باغ ہو گئی۔
(۲) اسلم نتیجہ نکلنے کی فکر میں بیٹھا تھا۔ کامیاب ہونے کی خبر سن کر باغ باغ ہو گیا۔

ان دونوں فقروں کو دیکھیں۔ باغ باغ ہونا کے معنے خوش ہونا کے سوا

اور کچھ نہیں ہو سکتے۔

اوس پڑنا۔(۱) موسمِ خزاں کی تباہی سے پھولوں پر بھی اوس پڑ گئی۔

(۲) اب کوئی پھول بھی تروتازہ دکھائی نہیں دیتا۔ سب پر اوس پڑ گئی ہے۔

اوس پڑنا کے معنی واضح ہیں۔

اسی طرح اور چند محاورات کا استعمال بھی دیکھیں :۔

{بغلیں بجانا - خوش ہونا} بغلیں بجا رہے ہیں رقیبانِ سرفراز۔

{بغلیں جھانکنا - پریشان ہونا} مَیں بغلیں جھانکتا ہوں مرا سر بغل میں ہے۔ (امین)

{چار چاند لگنا - زیادہ بڑھنا یا مشہور ہونا} یتیم خانہ کی تعمیر سے انجمن کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

{غم کھانا - ہمدردی کرنا - دریغ کرنا} اس مصیبت میں میرا غم کھانے والا کون تھا۔

اسی طرح ضرب الامثال کا استعمال دیکھو :۔

بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی - کسی نادہند سے جو کچھ مل جائے غنیمت ہے۔

استعمال :۔ ناظر اپنی بہن کا سارا روپیہ مار بیٹھا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک چوتھائی وصول ہُوا ہے۔ (چلو بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی)

آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا - ایک بڑی مصیبت سے رہائی پائی۔ لیکن ایک دوسری مصیبت میں پھنس گیا۔

استعمال :۔ واجد قتل کے مقدمہ سے بَری ہُوا تو چوری کے الزام میں دھر لیا گیا۔

(آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا اسے کہتے ہیں)

عام اغلاط کی درستی

کسی فقرے کی صحت کو جانچنے کے لئے مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھنا چاہئے۔

(ا) روزمرّہ کی پابندی۔ روزمرّہ سے یہ مراد ہے کہ الفاظ کو اُسی طرح استعمال کیا جائے۔ جس طرح اہلِ زبان کرتے ہیں۔ اگر کوئی فقرہ روزمرّہ کے خلاف ہوگا۔ تو غلط ہوگا۔ مثلاً اہل زبان کہتے ہیں۔ چار دن کی چاندنی ہے۔ پھر اندھیری رات ہے۔ اب اگر کوئی کہے پندرہ دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے تو غلط ہوگا یا دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے غائب ہو گیا کی بجائے دیکھتے دیکھتے وہ نظروں سے غائب ہو گیا غلط ہے۔

یا اُس نے کھری کھری باتیں سنائیں کی بجائے سچی سچی باتیں سنائیں غلط ہے۔ یا شکاری نے چپ سادھ لی کی بجائے شکاری نے خاموشی سادھ لی غلط ہے۔

غرضیکہ اہل زبان کی تحریر و تقریر کا خاص لحاظ رکھنا چاہیئے اور اساتذہ کے کلام کا وسیع مطالعہ کرنا چاہیئے۔ تاکہ ایسی غلطیوں کا اندازہ کر سکیں جو روزمرّہ کی پابندی نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور جو لفظ جس موقع و محل پر اہل زبان بولتے ہیں وہی لفظ ہم بولیں۔ مثلاً بہترین نظارے جو آنکھوں کے سامنے ہوں اُن کے لئے اہلِ زبان "جنّت نگاہ" بولتے ہیں۔ اور بہترین نغمے جن کو سُن کر جان محفوظ ہو۔ فردوس گوش کا نام پاتے ہیں۔ ان کو بدل کر فردوس نگاہ اور جنّت گوش لکھنا غلط ہے۔

اسی طرح سدِ باب کرنا صحیح ہے اور سدِ باب ہونا غلط ہے۔ اور سدِ راہ ہونا صحیح اور سدِ راہ کرنا غلط۔ اُردو میں انگارہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور

اس کے مقابل تھوڑی سی آگ کو چنگاری کہتے ہیں۔ پنجابی میں اس کے الٹ انگاری اور چنگاڑہ بولتے ہیں۔ پس پنجابی کا خیال رکھ کر انہیں اردو میں انگاری اور چنگاڑہ لکھنا غلط ہے۔

مختصر یہ کہ تحریر و تقریر میں روزمرّہ کی پابندی لازمی ہے۔ اور اسی کو فصاحت کہتے ہیں اور یہ بغیر مطالعہ کے حاصل نہیں ہوتی۔

(۲) **مرکبّات کی صحت** ۔ اردو میں مرکبّات ناقص کی ترکیبیں جس طرح ہوتی ہیں۔ ان کا خیال رکھیں۔

(۱) مضاف الیہ پہلے اور مضاف بعد میں جیسے زید کا بھائی۔ یہاں زید مضاف الیہ ہے۔ اور بھائی مضاف۔ اردو فقرات میں یہ ترتیب قائم رہنی چاہیئے۔ اسے الٹنا نہیں چاہیئے۔ زید کا بھائی آیا صحیح اور بھائی زید کا آیا غلط ہے۔

(۲) لفظ صفت پہلے اور موصوف بعد میں آنا ہے۔ جیسے سستا کپڑا میں سستا صفت اور کپڑا موصوف ہے۔ اس لحاظ سے "میں نے سستا کپڑا خریدا" صحیح ہے۔ اور اگر کوئی کہے میں نے کپڑا سستا خریدا۔ تو سستا کپڑے کی صفت نہ ہوگا۔ بلکہ خریدا کا متعلق فعل بن جائے گا۔

(۳) عدد پہلے اور معدود بعد میں آنا چاہیئے جیسے دو گھوڑے میں دو عدد اور گھوڑے معدود ہے۔ دو گھوڑے بیٹھے تھے۔ باقی چراگاہ میں چر رہے تھے ایک صحیح فقرہ ہے۔ اسے یوں لکھنا "گھوڑے دو بیٹھے تھے۔ باقی چر رہے تھے۔" غلط ہے۔ البتہ جہاں کل تعداد سے چند کا ذکر مقصود ہو وہاں یوں لکھتے ہیں سپاہیوں میں چار جوان تھے باقی بوڑھے۔ لیکن ایسے موقع پر عدد کے ساتھ معدود کا ذکر ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً ان آدمیوں میں چار آدمی اور آ شامل ہوئے۔

(۴) اشارہ پہلے اور مشارٌالیہ بعد میں آتا ہے۔ اِس کا مفصّل حال ضمیر اشارہ کے تحت آ چکا ہے۔

(۵) مجرور پہلے اور حرفِ جار بعد میں آتا ہے۔ جیسے گھر میں۔ شہر تک۔ وغیرہ میں گھر اور شہر مجرور اور میں اور تک حروفِ جار ہیں۔

پس جو فقرہ تمہارے سامنے آئے۔ اسے دیکھو اگر مندرجہ بالا قواعد کے ماتحت مرکبات کی ترکیبیں لکھی گئی ہیں۔ تو فقرہ صحیح ہے۔ ورنہ ان قواعد کے ماتحت اسے صحیح کر دو۔

(۳) تذکیر و تانیث۔ عام طور پر طالب علموں کے سامنے ایسے غلط فقرات رکھے جاتے ہیں جن میں کسی مذکر لفظ کو مؤنث اور مؤنث کو مذکر استعمال کیا ہوتا ہے۔ پس تذکیر و تانیث کے باب میں جن اصولوں کا ذکر ہوا ہے۔ اُن کے ماتحت فقرہ درست کر دو۔ مثلاً مرض بڑھتی گئی غلط ہے۔ مرض بڑھتا گیا صحیح ہے۔

(۴) واحد و جمع کی غلطیاں۔ وحدت و جمع کے قاعدوں کے ماتحت دیکھو کہ جمع صحیح ہے یا غلط اور مناسب ہو تو درست کرو۔

(۵) افعال کی صحت۔ تذکیر و تانیث کے لحاظ سے فعل بھی غلط ہوتے ہیں۔ غلط فقرات میں دیکھو کہ فاعل مذکر ہے یا مؤنث۔ اس کے لحاظ سے فعل کو درست کر دو مثلاً زید آ کر بیٹھ گئی غلط ہے۔ زید آ کر بیٹھ گیا صحیح کرو۔ عورت چلا گیا غلط اور عورت چلی گئی صحیح ہے۔

اسی طرح فاعل واحد و جمع کے لحاظ سے فعل واحد یا جمع لکھو۔ مثلاً لڑکا بیٹھ گئے غلط اور لڑکا بیٹھ گیا درست ہے احمد اور اکرم روٹی کھانے لگا غلط اور احمد اور اکرم روٹی کھانے لگے درست ہے۔

(۶) **املا کی غلطیاں** - غلط فقرات میں بعض دفعہ املا کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ اُن کو درست کرنے کے لئے طالب علم کے پاس الفاظ اور ان کے معانی کا ذخیرہ ہونا چاہیئے۔ اور دماغ کو فقرے کا مفہوم سمجھنے کے لئے تیار کرنا چاہیئے ورنہ یہ غلطیاں درست نہ ہوسکیں گی۔ مثلاً کثرت اور کسرت کے الفاظ ہیں۔ اگر فقرہ لکھا ہو "لوگ کسرت سے جمع ہو گئے" تو طالب علم ممکن ہے اُسے جلدی صحیح کرکے "کثرت سے جمع ہو گئے" لکھ دے۔ کیونکہ کثرت کا لفظ اکثر و بیشتر اس کی نظروں سے گزرا ہے لیکن اگر فقرہ لکھا ہو۔ کسرت سے لوگوں کے جسم مضبوط ہو جاتے ہیں۔ تو اسے غلط کر دے گا۔ اور یہاں بھی "کثرت سے" لکھ دے گا اور اس کا سبب یہ ہوگا کہ اس نے کسرت کا لفظ ہی نہیں پڑھا۔ پس ہم آواز الفاظ خاص طور پر یاد ہونے چاہئیں۔ طلباء کی رہنمائی کے لئے چند الفاظ درج ذیل کئے جاتے ہیں:-

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
ابد	ہمیشہ	عرض	التجا	علیم	جاننے والا
عبد	بندہ	اثیر	اثر کرنے والا	ام	ماں
امل	امید۔	اسیر	قیدی	عم	چچا
عمل	کام۔ ملازمت	آم	ایک پھل	امر	کام
اثر	نشان	عام	جو خاص نہ ہو	عمر	زندگی
عصر	زمانہ	آسی	امیدوار	عمرو	ایک نام
عُسر	تنگی	عاصی	گنہگار	اسم	نام
اقرب	زیادہ قریب	آک	ایک درخت	اثم	گناہ
عقرب	بچھو	عاق	بے دخل۔ بے نصیب	آری	ایک اوزار
ارض	زمین	الیم	دردناک	عاری	خالی

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
ارب	دس کروڑ	بکر	ایک نام	صبا	ہوا
عرب	ایک مُلک	بقر	گائے	سبع	سات
اسرار	بھید	تہ	نچلی سطح	سفیر	ایلچی
اِصرار	ضد کرنا	طے	ختم کرنا۔ ایک	صفیر	آواز
آر	ایک اوزار		خاندان۔	شک	شبہ
عار	شرم	جزا	بدلہ، صلہ	شق	پھٹنا
اَلم	رنج	جزع	رونا	عبا	چُغہ
عَلم	جھنڈا	حرث	کھیتی	اَبا	انکار
اکل	کھانا	حرص	لالچ	اَبا	باپ
اقل	بہت چھوٹا	حَرس	گھوڑا	عرق	کشید کیا ہوا پانی
عقل	سمجھ	ذرّہ	مٹی کا باریک دانہ	ارک	قلعہ
ازل	ابتدائے عالم	زِرہ	فولادی جالی کا	فک ہونا	آزاد ہونا
عزل	بیکاری		کوٹ	فق ہونا	اُڑ جانا۔ پھیکا ہونا
باد	ہوا	زلال	صاف۔ نتھرا ہوا	قائد	رہبر
بَعد	پیچھے	ظلال	جمع ظل۔ سائے	کائد	مکار
بُعد	دُوری	سدا	ہمیشہ	برس	سال
باگ	گھوڑے کی باگ	صدا	آواز	برص	ایک بیماری
باغ	چمن	سریع	تیز	بسر	گزر
باز	ایک جانور	صریح	واضح	بصر	آنکھ۔ بینائی
بعض	کئی	سبا	ایک شہر	تیَر	تیرنا کا فعل امر

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
طیر	پرندہ	عظم	بڑائی	راح	آرام
جزء	سوا	فساد	جھگڑا	رکیک	کم حیثیت۔ادنیٰ
جزو	حصہ	فصاد	فصد کرنے والا	رقیق	پتلا
حل	شرح	قید	بند ہونا	سہی	ایک لفظ
ہل	ایک اوزار	کید	مکر	صحیح	درست
راضی	خوش	باک	ڈر۔خوف	ساکت	خاموش
رازی	رے کا باشندہ	باق	باقی رہنے والا	ساقط	گرنے والا
زمن	جمع زمانہ	توبہ	معافی چاہنا	صلا	آواز
ضمن	درمیان	طوبیٰ	بہشت کا	صلہ	بدلہ
سیاہ	کالا		ایک درخت	صلح	میل ملاپ
سیاح	سیر کرنے والا	تارک	چھوڑنے والا	صلاح	نیکی
سد	دیوار	طارق	ایک نام	عمارت	مکان بنانا
صد	سو	چک	ہنڈی	امارت	امیری
سورت	ایک شہر	چق	پردے کی سرکی	فکر	سوچنا
صورت	شکل	حوا	آدم کی بیوی	فقر	فقیری
صواب	درست	ہوّا	فرضی ڈراؤنا	قہر	غصہ
ثواب	نیکی	ہوا	باد	قعر	گہرائی
عسل	شہد	خلا	خالی جگہ	قدر	اندازہ
اصل	جڑ	خلع	طلاق	کدر	میلا
عزم	ارادہ	راہ	راستہ	بہار	ایک موسم

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
بحار	جمع (سمندر)	ثمر	پھل	کرب	بے چینی۔ مصیبت
تول	وزن	ضیاء	روشنی	مزہ	ذائقہ
طول	لمبائی	ضیاع	ضائع کرنا	مزاح	مخول
تلا	نچلا حصّہ	ضمہ	پیش	مکر	فریب
طلا	سنہری	ذمّہ	اختیار	مقر	ٹھیرنے کی جگہ
جرّہ	ایک جانور	عجل	بچھڑا	محدود	جس کی حد مقرر ہو
جرعہ	گھونٹ	اجل	وقت۔ موت	معدود	جس کو گنا گیا ہو
جرح	چیرنا۔ بحث کرنا	فلک	آسمان	مودود	خدا کا نام
چاک	کھڑیا۔ پھاڑنا	فلق	پھاڑنا	مزارع	کھیتی کرنیوالا
چاق	ہوشیار	قابل	لائق	مضارع	ایک فعل کا نام
دعا	چاہنا۔ مانگنا	کابل	ایک شہر	مہک	خوشبو
دوا	دارو۔ علاج	قاصد	پیغامبر	محک	کسوٹی
زن	عورت	کاسد	کھوٹا	نظیر	مثال
ظن	گمان	قونصل	سفیر	نذیر	ڈرانے والا۔
زال	رستم کے باپ	کونسل	مجلس		خدا کا نام۔
	کا نام۔	قصور	ایک شہر۔ جمع	قوی	طاقتور
ضال	گمراہ		قصر۔ گناہ۔	کوی	شاعر (ہندی)
سفر	راستہ طے کرنا	کسور	جمع کسر۔ اکائی	قمر	چاند
صفر	ایک قمری مہینہ		کے حصے	کمر	جسم کا حصّہ
سمر	کہانی	قرب	نزدیکی	کثرت	زیادتی

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
کسرت	ورزش	قل	کہو۔ قرآن مجید کی ایک سورۃ	نسر	ایک ستارہ
مشک	پانی بھرنے کا آلہ	کل	تمام	ہال	بڑا کمرہ
مشق	ایک فعل کا بار بار کرنا۔	برکہ	حوض	حال	حالت
مکرّر	دوبارہ۔ باربار	برقع	پردہ کی چادر	قصر	محل
مقرر	جس کو لگایا گیا ہو۔	مامور	مقرر کیا ہوا	کسر	کمی
مقرِّر	تقریر کرنیوالا۔	معمور	بھرا ہوا	قلب	دل
مرز	ولایت	ماکول	جسے کھایا گیا ہو	کلب	کلبا۔ انجمن (انگریزی)
مرض	بیماری	معقول	عقل کے مطابق۔ پورا۔	لال	سُرخ
مَلَک	فرشتہ	منصُور	فتحیاب	لعل	ایک جواہر
مَلِک	بادشاہ	منشور	نشر کیا ہوا۔ بکھرا ہوا	مطبوُع	چھپا ہوا۔ پسند
مِلک	جائداد	مذموم	جس کی مذمت کی گئی۔ بُرا۔	متبوع	جس کے تابع ہو
مُلک	بادشاہی	مضمُوم	جس حرف پر ضمہ یا پیش ہو	موسوم	جسکا نام رکھا ہو
نسب	خاندان	نثر	سادہ عبارت	معصوم	بے گناہ
نصب	گاڑنا	(ب)	بکھرنا۔	مؤجل	وقت مقررہ والا
ورا	پرے	نصر	فتح	معجل	جلدی والا
ورع	پرہیزگاری			مایہ	سرمایہ۔ پونجی۔
قوےٰ	جمع قوۃ			مائعُ	بہنے والی شے
کوا	ایک جانور			نذر	چڑھاوا
				نظر	بینائی
				ہول	ڈر

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
حول	گرداگرد	حمّ	گرم	تعجیل	جلدی کرنا
حذر	ڈر۔ خوف۔	محصول	لگان	بہر	واسطے
	احتیاط	موصول	وصول ہونا	بحر	سمندر۔ شعر
حضر	حاضر ہونا۔ شہر	ذرا	تھوڑا		کا وزن
	میں رہنا۔	ذرع	گز	وسیع	کھلا
ذری	تھوڑی	سرہ	کھرا	وصی	وصیت کرنیوالا
زری	سونے کے تاروں	صرہ	تھیلی	اناس	جمع ناس۔
	سے بنا ہوا کپڑا	صرع	مرگی۔ (ایک		لوگ۔
جوئے	نہر		بیماری)	اناث	جمع مؤنث
جوع	بھوک	عزا	ماتم۔ سوگ		عورتیں
خدا	ذاتِ باری	ایذا	تکلیف	غذا	خوراک
خدع	مکر فریب	ایضاح	واضح کرنا	غزا	مذہبی جنگ
ہجر	جدائی	فسیح	فراخ	قبل	ناکامیاب
حجر	پتھر	فصیح	خوش بیان	فعل	کام
احتراز	پرہیز	نفس	سانس	واضح	ظاہر
اعتراض	منہ پھیرنا۔	نفث	تھوکنا	واضع	وضع کرنے
	نفرت کرنا۔	سمع	سننا		والا
گدا	فقیر	سماع	راگ	جمع	ایک سے زیادہ
گدھا	ایک چوپایہ	تاجیل	وقت مقررہ	جماع	ہم بستر ہونا
ہمّ	ہمّت		طلب کرنا	جمعہ	ایک دن کا نام

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
سمن	عدالت کا اطلاع نامہ	وجہ	سبب	وِسل	سیٹی
ثمن	قیمت	وجع	درد	وصل	میل ملاپ
فائدہ	نفع	نزع	جانکنی	فوائد	جمع فائدہ
قاعدہ	دستور	نزاع	جھگڑا	قواعد	جمع قاعدہ

(۷) جانوروں کی آوازیں۔ بعض دفعہ فقرے محض جانوروں کی آوازوں کے غلط درج کرنے سے غلط ہوتے ہیں۔ اور کسی جانور کی اصلی آواز کی بجائے دوسرے جانور کی آواز لکھی ہوتی ہے۔ مثلاً کوّے چوں چوں کرتے ہیں۔ غلط ہے۔ کوے کائیں کائیں کرتے ہیں صحیح ہے۔
ذیل میں چند جانوروں کی آوازیں لکھی جاتی ہیں۔ تاکہ طلباء کے کام آئیں۔

شیر دھاڑتے ہیں۔ ہاتھی چنگھاڑتے ہیں۔ گھوڑے ہنہناتے ہیں۔ گدھے رینگتے ہیں۔ بکریاں میں میں کرتی (ممیاتی) ہیں۔ بھیڑیں بھیں بھیں کرتی ہیں۔ گائیں بھینسیں ڈکارتی ہیں۔ سانپ پھنکارتے ہیں۔ مور جھنکارتے ہیں۔ مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ کوّے کائیں کائیں کرتے ہیں۔ طوطے ٹیں ٹیں کرتے ہیں۔ چڑیاں چوں چوں کرتی ہیں۔ کوئل کی کوک مشہور ہے۔ وہ کوکتی ہے۔ قمریاں کوکو کرتی ہیں۔ مرغی کُڑ کُڑ کرتی ہے۔ مرغا ککڑوں کوں کی آواز نکالتا ہے۔ کتا بھونکتا ہے۔ بھوں بھوں کرتا ہے۔ جب کسی دوسرے کتے سے لڑتا ہے تو عف عف کرتا ہے۔ گیدڑ ہواں ہواں کرتا (ہوانکتا) ہے۔ کبوتر غٹرغوں کرتا ہے۔ پپیہا پی پی کرتا ہے۔ بلیاں میاؤں میاؤں کرتی ہیں۔ چوہے چیں چیں کرتے ہیں۔

مینڈک ٹرّاتے ہیں۔ ٹڈیاں۔ سانپ اور دوسرے کیڑے جن کے بولنے کی آواز آتی ہے۔ رینگتے ہیں۔ اونٹ بلبلاتے ہیں۔ بطخیں قیں قیں کرتی ہیں۔ بٹ۔ ر چہچہاتے ہیں۔ اُلّو چیختے ہیں۔ چمگادڑ چخ چخ کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا عام مشہور جانوروں کی آوازیں ہیں۔ جن جانوروں کی آوازوں کا یہاں ذکر نہیں۔ ان کی جنس کے لحاظ سے ان کی آوازیں لکھی جائیں گی۔ مثلاً بھیڑیے اور لومڑی کی آواز گیدڑ کی آواز سے ملتی ہے۔ مچھر کی مکھی سے اور ہرن کی آواز بکری سے۔ اُن کے لئے وہ آوازیں لکھدو جو گیدڑ۔ مکھی اور بکری کی ہیں۔ عام پرندوں کے لئے چہچہانا آتا ہے۔ اور عام چوپایوں اور درندوں کے لئے بولنا۔ پس جہاں کسی جانور کی آواز پر شبہ ہو بولنا یا چہچہانا مصدروں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

نوٹ:۔ سریلی آواز والے جانوروں کے لئے گانا یا نغمہ سرائی کے الفاظ استعمال کئے جائیں۔

جانوروں کی آوازوں کے علاوہ چند اور آوازیں بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں:۔

گولہ پھٹنے کی آواز۔ (پھٹ اڑا اڑا دھوں) سیڑھیوں پر چڑھنے یا کسی چیز پر ضرب لگانے کی آواز۔ (کھٹ کھٹ) ڈھنڈورے کی آواز۔ (ڈم ڈھم ڈم ڈھم) ہاتھی کو چلانے کی آواز۔ (بری بری) جانوروں کو ہانکنے کی آواز۔ (ٹٹخارنا۔ ٹخ ٹخ کرنا) کپڑے دھونے کی آواز۔ (چھُوا چھُو) کم بارش یا بوندا باندی۔ (رِم جھِم) زیادہ بارش کی آواز۔ (چھم چھم) تیر اور گولی چلنے اور آگ کے بجھنے کی آواز۔ (سَن) زیور کی آواز۔ (جھنکار) چلتے وقت جوتیوں کی آواز۔ (چٹخار۔ (جوتیاں چٹخانا)) ڈھول دَھپّے یا مارپیٹ کی آواز۔

(چٹاخ پٹاخ) بادل کی آواز۔ (گرج) ہوا کے تیز چلنے کی آواز۔ (سائیں سائیں)
توپ چلنے کی آواز۔ (دَن) زمین پر کسی چیز کے گرنے کی آواز۔ (دھم) بجلی گرنے
کی آواز۔ (کڑک) انڈا پھٹنے کی آواز۔ (تڑاق) حقے کی آواز (گُڑگُڑ) بوتل۔ صراحی
یا حلق سے نیچے شربت یا پانی گرنے کی آواز۔ (غٹ غٹ۔ جس کو صوفی لوگ حق
حق سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ع

جو ذکر اللہ کو ہو ذوق مانع مایۂ عشرت ۔۔۔ لگیں حق حق کرے وہ شیشہ جس شیشے میں صہبا ہو)

انجن چلنے کی آواز۔ (چھک چھک) دانے چبانے کی آواز۔ (کُڑ کُڑ) روٹی چبانے
کی آواز۔ (چپک چپک) حشرات الارض کے جم غفیر کی آواز۔ (کلبلاہٹ) گٹھری
کی آواز۔ (چلچل) گاڑی یا چھکڑے کی آواز۔ (گڑگڑاہٹ) یادِ الٰہی کا شور۔
(ہو حق) کاغذ یا کپڑا پھاڑنے کی آواز۔ (چرچر) بلی۔ کتے اور دوسرے درندوں
کے پیار کی آواز۔ (غُرغُر) بچے کی بے معنی آواز۔ (غوں غاں) چھینکنے کی آواز۔
(آچھی) پانی کے تیز بہنے اور آٹا پیسنے کی آواز (گرر گرر) گھڑی کی آواز۔ (ٹک ٹک)
کنواں چلنے کی آواز۔ (روں روں)

نوٹ:۔ تمام آوازوں میں عموماً تکرار ہوتی ہے۔ اس لئے مفرد لفظ سے
انہیں لکھنا غلط ہوتا ہے۔ مثلاً غٹ غٹ کرکے پانی پی لیا۔ بلی پیار سے غُرغُر
کرنے لگی۔ یہاں غٹ کرکے پانی پی لیا یا بلی غُر کرنے لگی غلط ہوگا۔

البتہ جہاں مفرد آواز ہے وہاں مفرد لکھو مثلاً جوتیاں چٹخاتا چلا گیا۔
انڈا تڑاق سے پھٹ گیا وغیرہ۔

(۸) مترادف الفاظ کا غلط استعمال۔ (۱) بعض دفعہ فقرات میں
ہم معنی الفاظ کو اس طرح رکھا جاتا ہے کہ ایک لفظ بے ضرورت ہوتا ہے اور
اس سے فقرہ غلط ہوجاتا ہے۔ اور یہ غلطی عام طور پر دو زبانوں کے مترادف

الفاظ لکھتے وقت کی جاتی ہے۔

مثلاً (۱) منگل وار کا دن تھا۔ (۲) شب برات کی رات تھی۔ (۳) لیلۃ القدر کی رات تھی۔ (۴) ماہ رمضان کا مہینہ تھا۔ (۵) سن ہجری کا چوتھا سال تھا وغیرہ ایسے تمام فقرے غلط ہوتے ہیں۔ کیونکہ وار ہندی میں دن کو کہتے ہیں۔ اور منگل وار کے معنے ہیں منگل کا دن۔ پھر وار کے ساتھ دن لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح شب اور لیل رات کے معنے دیتے ہیں۔ اس لئے شب برات تھی یا لیلۃ القدر تھی۔ لکھنا چاہیئے۔ اسی طرح رمضان سے پہلے ماہ کا لفظ موجود ہے۔ جس کے معنے مہینہ کے ہیں۔ اس لئے رمضان کا مہینہ تھا۔ یا ماہ رمضان تھا لکھنا چاہیئے۔ اسی طرح سَن کے معنے سال کے ہیں ہجرت کا چوتھا سال تھا یا چار سن ہجری تھا صحیح ہے۔ البتہ جہاں دن۔ رات۔ مہینہ یا سال کو اشارہ سے خاص کیا جائے۔ وہاں اس کے بعد مترادف الفاظ لانا جائز اور درست ہے۔ مثلاً وہ دن منگل کا دن تھا یا وہ دن منگل وار تھا۔ وہ رات شب برات تھی۔ وہ مہینہ ماہ رمضان تھا۔ وہ سال چوتھا سن ہجری تھا وغیرہ۔

اسی طرح دیگر مقامات پر جہاں اشارہ موجود ہو مترادف الفاظ لانا درست ہوتا ہے۔ اور اس کے بغیر غلط۔ مثلاً یہ گھر مسافر خانہ ہے۔ یہ باغ فیض باغ ہے۔ درست ہیں۔ مسافر خانہ کا گھر۔ فیض باغ کا باغ۔ گورنمنٹ سکول کا مدرسہ۔ انڈی پن کا قلم۔ شاخ طوبیٰ کی ٹہنی۔ جنت الماویٰ کا بہشت۔ آب زمزم کا پانی۔ نارِ جہنم کی آگ۔ گلِ نرگس کا پھول۔ حجرِ اسود کا پتھر۔ سنگِ مرمر کا پتھر۔ فصیلِ شہر کی دیوار۔ کوہ طور کا پہاڑ۔ جامِ جم کا پیالہ۔ انار دانے کا دانہ۔ پوست ہلیلہ کا چھلکا۔ تخمِ کاہو کے بیج وغیرہ سب غلط ہیں۔ (انہیں

درست کرو۔)

(۲) بعض دفعہ ایک لفظ کی تشریح کے لئے ایک اور ایسا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جو اسی کا ہم معنی ہو۔ اور وہ غیر فصیح ہوتا ہے۔ مثلاً (۱) اس درد کی تکلیف نے مجھے سونے نہ دیا۔ (۲) اس رونق کی چہل پہل کیا بیان کروں۔ (۳) خوشی کے چاؤ میں لڑکا اُچھلنے لگا۔ (۴) دریا کے بہاؤ کی روانی تیز ہو گئی وغیرہ غلط فقرے ہیں۔ ان سے تکلیف۔ چہل پہل۔ چاؤ اور روانی کو نکال دیں۔ تو اصل فصیح فقرے یہ بنتے ہیں:۔

(۱) اس درد نے مجھے سونے نہ دیا۔ (۲) اس رونق کا کیا بیان کروں (۳) خوشی میں آکر لڑکا اچھلنے لگا۔ (۴) دریا کا بہاؤ تیز ہو گیا۔

یا درد۔ رونق۔ خوشی اور بہاؤ کے الفاظ کاٹ دیں۔ تو موزوں فقرے یوں بنتے ہیں:۔

(۱) اس تکلیف نے مجھے سونے نہ دیا۔ (۲) اس چہل پہل کا کیا بیان کروں۔ (۳) چاؤ سے لڑکا اچھلنے لگا۔ (۴) دریا کی روانی تیز ہو گئی۔ پس اس قسم کے زائد الفاظ سے بچنا چاہیئے۔ البتہ اگر حرفِ اضافت اُڑا کر اور حرفِ عطف لگا دیا جائے تو اس قسم کے مترادف الفاظ حسین ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ان فقرات کو یوں لکھنا بہتر ہے:۔

(۱) اس درد اور تکلیف نے مجھے سونے نہ دیا۔ (۲) اس رونق اور چہل پہل کا کیا بیان کروں وغیرہ۔ اور اس طرح کلام میں زور پیدا ہوتا ہے۔

اسی طرح کالی سیاہ رات۔ چٹا سفید کپڑا۔ لال سرخ انگارہ وغیرہ میں مترادف الفاظ کا استعمال غلط ہے۔ پہلے الفاظ اس رنگ میں غلط ہوتے ہیں۔ سیاہ رات۔ سفید کپڑا۔ سُرخ انگارہ لکھنا چاہیئے۔

(۳) بعض دفعہ ایک ہی لفظ کو بار بار استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تکرارِ قبیح ہوتی ہے۔ مثلاً

دریا سے کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ دریا کا پانی پیتے ہیں۔ دریا سے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ دریا کی ریت سے سونا نکالتے ہیں۔ یہاں دریا کا لفظ بار بار استعمال ہوا ہے اور بہت برا معلوم ہوتا ہے۔

ایسے موقعوں پر کسی اسم کو ایک دفعہ استعمال کر کے پھر ضمیروں کو استعمال کرنا چاہیئے۔ مثلاً دریا کا پانی پیتے ہیں۔ اس سے مچھلیاں پکڑتے ہیں اور کہیں کہیں اس کی ریت سے سونا بھی نکالتے ہیں۔

اس قسم کی تکرارِ قبیح معمولی آدمیوں کی تحریروں ہی میں نہیں ملتی بلکہ بعض دفعہ اساتذہ بھی اس قباحت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ غالب کا ایک مشہور شعر دیکھئے۔ ؎

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

تمام اساتذۂ اردو متفق ہیں کہ اس شعر میں تکرار قبیح ہے۔

میرا خیال ہے کہ اگر یہ شعر اس طرح ہوتا تو زیادہ رنگ پکڑتا۔ ؎

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی غالب تقدیر
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۴) حروف کی تکرار سے بھی اکثر فقرات ناگوار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

یہاں سونے اور چاندی اور تانبے اور پیتل کے برتن بنتے ہیں۔ اس فقرے میں "اور" کی تکرار معیوب ہے۔ یاد رہے کہ جہاں بہت سی چیزوں کا ایک جگہ ذکر کرنا ہو وہاں "اور" کا حرفِ عطف آخری دو الفاظ کے درمیان لانا چاہئے

مندرجہ بالا یوں صحیح ہوگا۔ یہاں سونے چاندی۔ تانبے اور پیتل کے برتن بنتے ہیں۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ الفاظ کی تکرار ہر جگہ معیوب ہوتی ہے۔ بلکہ جاننا چاہیئے کہ استفہام کے موقعوں پر یا کسی شے کی تخصیص کی تشریح کے لئے یا کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے الفاظ کی جو تکرار ہوتی ہے۔ وہ حسین ہوتی ہے مثلاً

(۱) بڑھیا نے کہا۔ سردی! سردی کا کیا کہنا۔۔۔۔ الخ (۲) پولیس نے تھل سنگھ نامی ڈاکو کو گرفتار کر لیا ہے۔ یہی وہ ڈاکو ہے۔ جس نے شاہی محلات پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ (۳) وہ ڈر ڈر کر چلاتے تھے کہ ہے ہے موت۔ ہے ہے موت۔

یا فارسی کا یہ شعر ؎

ساقیا ساقیا۔ شراب شراب   اندکے اندکے شتاب شتاب

ان تمام مثالوں میں الفاظ کی تکرار حسین ہے۔

(۹) شتر گربہ۔ خطوط اور عرائض لکھنے والے بعض حضرات اکثر یہ غلطی کھاتے ہیں۔ کہ مخاطب یا مکتوب الیہ کے لئے ایک دفعہ عزت افزائی یا برتری کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اور اس خط یا درخواست میں پھر کمتری کے الفاظ استعمال کر دیتے ہیں۔ یا اس کے برعکس پہلے کمتری کے الفاظ استعمال کر کے پھر برتری کے الفاظ لاتے ہیں۔ یہ ایک عیب ہے۔ جسے شتر گربہ کہتے ہیں۔

مثلاً ایک صاحب اپنے دوست کو یوں خط لکھتے ہیں:۔

پیارے انور!

السلام علیکم۔ آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ بھائی اختر کی شادی ہے۔ اور میں مصروف ہوں۔ ابھی نہیں آ سکتا۔۔۔۔۔

دیکھیئے شروع میں آپ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور پھر ساتھ ہی تمہیں لکھ دیا گیا ہے۔ یہ قطعاً ناجائز ہے۔ تمہیں کی بجائے آپ کو لکھنا چاہئیے تھا۔ یا مثلاً بڑا بھائی چھوٹے بھائی کو خط لکھتا ہے :-

عزیزی اختر!

دعوات۔ تمہارے نتیجہ کی اطلاع پہنچی جس سے معلوم ہُوا کہ تم جنرل نالج کے پرچہ میں فیل ہو۔ آیندہ اس کمی کو پورا کرنا آپ کے لئے لازمی ہے ....

یہاں شروع میں تم کے لفظ سے خطاب کر کے پھر آپ کہنا غلط ہے۔ یہ عیب بھی ایسا ہے۔ جس سے بعض دفعہ بلند پایہ ادیب بھی نہیں بچ سکے۔ مثال کے طور پر مکاتیب غالب دیکھیئے۔ مرزا غالب نے نواب رامپور کی خدمت میں بہت سے خطوط لکھے ہیں۔ جن میں انہیں حضور۔ والاجاہ۔ آپ وغیرہ کے تعظیمی الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔ مگر ان خطوط کے خاتمہ پر یہ دعائیہ شعر درج کیا ہے۔ ؎

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

بس یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اگر کسی بڑے آدمی کے لئے آپ۔ حضور وغیرہ تعظیمی الفاظ استعمال کئے جائیں تو پھر تو اور تم وغیرہ الفاظ سے مخاطب نہیں کرنا چاہیئے۔ اور اگر کسی چھوٹے کو تو اور تم سے خطاب کیا ہے۔ تو اسے آپ اور جناب وغیرہ الفاظ سے سرفراز نہیں کرنا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں یہ بات خصوصی طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ذاتِ باری کے لئے ہمیشہ واحد غائب یا واحد حاضر کے صیغے استعمال کرنے چاہئیں جمع کے صیغے استعمال کرنا معیوب ہیں۔ مثلاً بعض مولوی صاحبان اپنے وعظ میں کہتے ہیں۔ اللہ صاحب فرماتے ہیں۔ رب العالمین حکم دیتے ہیں۔ یہ غلط

ہے۔ کیونکہ اگر اس ادب کے پیشِ نظر وہ یہ کہیں کہ انہوں نے ہمیں پیدا کیا وہ ہمیں رزق دیتے ہیں۔ تو شرک کا شبہ ہوگا کہ نعوذ باللہ پیدا کرنے والے اور رزق دینے والے ایک سے زیادہ ہیں۔

پس خدا تعالےٰ کی ذات واحد اور لاشریک کے لئے ہمیشہ واحد کے صیغے استعمال کرنے چاہئیں۔ اور اس اصول کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جس ذات کو بلند ترین درجے کا حامل قرار دیا جائے۔ اس کے لئے تو اور تم کے الفاظ استعمال کرنا ادیبوں کا شیوہ ہے۔ اور یہ اس لئے ہے کہ جناب اور حضور کے الفاظ سے تکلف اور مغایرت ظاہر ہوتے ہیں۔ اور کمال محبت اور بے تکلفی کا یہ تقاضا ہے کہ اپنے ممدوح یا مربی کو بے ساختگی سے تو اور تم کے الفاظ سے خطاب کیا جائے۔ چنانچہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے جو نعتیں لکھی گئی ہیں ان میں آپ کو انہی واحد حاضر یا واحد غائب کی ضمیروں سے یاد کیا گیا ہے۔ ایک فارسی نعت کا مشہور شعر ہے۔ ؎

حسنِ یوسف۔ دمِ عیسےٰ یدِ بیضا داری　　آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور اسی طرح مولانا حالی یوں تعریف کرتے ہیں۔ ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

اگرچہ بعض نعتیں اس قسم کی بھی نظر آئیں گی جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے آپ اور حضور کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں لیکن حمد باری تعالےٰ کا ایک شعر بھی کہیں نہیں ملے گا جس میں جمع غائب یا جمع حاضر کے صیغے لکھے گئے ہوں۔

ادب واحترام کا یہ رنگ بعض دیگر مقامات پر بھی سخت معیوب ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک صاحب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے

ہیں۔ "آپ کے باپ بُت گر اور بُت فروش تھے"۔ دیکھئے یہاں باپ پر بجائے واحد کے جمع ہونے کا شک گزر جاتا ہے۔ جیسا کوئی کہے۔ آپ کے بیل کمزور تھے۔ اور یہاں بیل واحد نہیں ہوگا بلکہ کئی بیل مراد ہوں گے۔

یاد رہے کہ ادب و احترام کا رنگ کسی اسم علم کے ساتھ پیدا کرنا ہو تو جائز ہے۔ لیکن ذاتِ باری کے لئے یہ نہیں چاہیئے۔ اور اسم نکرہ واحد کے لئے یہ رنگ ناجائز اور معیوب ہوتا ہے۔ البتہ عربی کے اسمائے فاعل کے ساتھ عزت افزائی کے الفاظ لگا کر انہیں یہ رنگ دیا جا سکتا ہے۔ جیسے ؎

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ
پر کوئی اتنا تو سمجھائے کہ سمجھائیں گے کیا

پس یہ فقرہ "آپ کے باپ بُت گر اور بُت فروش تھے"۔ یوں ہونا چاہیئے آپ کا باپ ایک بُت گر اور بُت فروش تھا۔

(۱۰) حروف کا غلط استعمال۔ بعض دفعہ فقروں میں حروف کو غلط طریق سے استعمال کیا ہوتا ہے۔ مثلاً

کیونکہ میں بیمار تھا اس لئے سکول نہ جا سکا غلط فقرہ ہے۔ کیونکہ کی بجائے چونکہ چاہیئے۔ اسی طرح دیگر حروف اپنے محل اور موقع کے مطابق استعمال کرنے چاہئیں۔ ان کا ذکر حروف کے بیان میں ہو چکا ہے +

خطوط نویسی

خط لکھتے وقت مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھنا چاہیئے:۔

(۱) دائیں طرف صفحہ کے کونے پر مقام اور تاریخ لکھو۔ اور بائیں طرف

مکتوب الیہ کے لئے مناسب القاب۔ پھر خط شروع کرو۔
(۲) اصل مطلب لکھنے سے پہلے آداب کا لکھنا ضروری ہے۔ اور آداب کے بعد مناسب مطلب لکھ دو۔
(۳) خاتمہ پر اپنا نام لکھنا چاہیئے۔

نمونہ ملاحظہ ہو

گوجرانوالہ
۱۵ر اگست ۱۹۵۲ء

ابّا جان

سلام۔ میں نے عید پر گھر آنے کے لئے رخصت حاصل کر لی ہے۔ امید ہے انشاءاللہ ۱۳ر اگست کو آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ امان اللہ کے لئے چند کھلونے خرید رکھے ہیں۔ اُسے بتا دیں کہ عید کے موقع پر اسے مل جائیں گے۔ میں ہمراہ لیتا آؤں گا۔ والدہ محترمہ کو میرا اسلام کہہ دیں۔ والسّلام۔

آپ کا
ریاض

لمبے چوڑے القاب پرانے زمانے میں لکھے جاتے تھے۔ اور اُن کے ساتھ آداب عرض کرتے وقت خط لکھنے والا اپنی انکساری اور تواضع ظاہر کرنے کے لئے کئی کئی سطریں وقف کر دیا کرتا تھا۔ آجکل یہ طریقے ترک ہو چکے ہیں۔ مختصر طور پر مناسب القاب و آداب کے الفاظ لکھنے چاہئیں چونکہ اکثر مبتدی بعض القابوں سے ناواقف ہیں۔ اس لئے ان کی آسانی کے لئے چند القاب درج کئے جاتے ہیں:-

باپ کے لئے ۔ ابّا جان جناب والد صاحب ۔
ماں کے لئے ۔ امّی جان ۔ جناب والدہ صاحبہ ۔
بڑی بہن کے لئے ۔ آپا جان ۔ ہمشیرہ محترمہ ۔
بڑے بھائی کے لئے ۔ بھائی جان ۔ برادرِ محترم ۔
چھوٹی بہن کے لئے ۔ } صرف ان کے نام لکھ دو ۔ یا
چھوٹے بھائی کے لئے ۔ } پیاری بہن ۔ پیارے بھائی لکھ کر نام لکھو ۔
چچا کے لئے ۔ جناب چچا صاحب یا عمِ محترم ۔
چچی کے لئے ۔ جناب چچی صاحبہ یا عمۃ محترمہ ۔
پھوپھا اور خالو کے لئے ۔ جناب خالو صاحب ۔
پھوپھی اور خالہ کے لئے ۔ جناب خالہ صاحبہ ۔
ماموں کے لئے ۔ جناب ماموں صاحب
ممانی کے لئے ۔ جناب ممانی صاحبہ
بیٹے کے لئے ۔ برخوردار ۔ بیٹا کے ساتھ اس کا نام
بیٹی کے لئے ۔ عزیزہ ۔ بیٹی کے ساتھ اس کا نام
دوست کے لئے ۔ پیارے دوست ۔ پیارے کے ساتھ اس کا نام
ہمعصر اجنبی کے لئے ۔ میاں صاحب ۔ مرزا صاحب ۔ چودھری صاحب یا
اس قسم کے نسبی القاب ۔
بیوی کے لئے ۔ میری ہمدم و ہم راز ۔ رفیقۂ حیات ۔

عرائض

عرائض لکھتے وقت سب سے پہلے اوپر کی سطر میں بائیں نصف جانب اس عہدیدار یا افسر کے لئے القاب لکھو۔ پھر دوسری سطر کے درمیان میں "جناب عالی" لکھ دو۔ اور تیسری سطر میں گذارش شروع کرو۔ خاتمہ پر اپنا نام اور پورا پتہ معہ تاریخ لکھنا چاہیئے۔ عرضیوں کے اندر شروع میں مقام و تاریخ لکھنا غلط ہوتا ہے۔

نمونہ حسب ذیل ہے

بخدمت جناب ضلعدار صاحب حلقہ کھڈیاں

جناب عالی

گذارش ہے کہ نہری پٹواری موضع کھڈیاں نے فصل خریف ۵۲ء کی آبپاشی کی نقل فرد کھتونی مجھے نہیں دی۔ اور مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ کس رقبہ کی آبپاشی کا آبیانہ میرے ذمہ واجب الادا ہے۔ ہر چند طلب کرتا ہوں مگر وہ لیت و لعل کرتا ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے نقل فرد کھتونی عطا فرمائی جائے۔ زیادہ آداب۔

العریض

شیر خاں ولد نامدار خاں راجپوت
وارڈ ۷ قصبہ کھڈیاں ضلع لاہور
31.8.52

طلباء اور عوام کی سہولت کے لئے ذیل میں چند امور کا ذکر کر کے بتایا جاتا ہے۔ کہ ان کے لئے کس افسر کی خدمت میں درخواست لکھنی چاہیئے:-

١- کسی پرائمری یا مڈل سکول کے اجراء کے لئے ٢- کسی پرائمری یا مڈل سکول کی ملازمت کے لئے ٣- نورمل سکول میں داخل ہونے کے لئے ٤- پرائمری اور مڈل مدارس سے متعلق عام امور و شکایات جنمیں مدرسین کے خلاف بھی شکایات ہو سکتی ہیں۔	جناب ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب مدارس ضلع....
٥- ہائی سکولوں سے متعلق جملہ معاملات کے لئے	جناب ڈویژنل انسپکٹر صاحب مدارس ڈویژن....
٦- اراضی مزارعہ کے لگان۔ مالگزاری۔ انتقال اور ردو بدل کے لئے۔ ٧- پٹواری کے خلاف شکایات۔	جناب تحصیلدار صاحب تحصیل......
٨- مدرسہ پٹوار میں داخل ہونے کیلئے علاقہ کے نظم و نسق کی خرابی عرض کرنے کیلئے جس میں صفائی بدامنی جنگلی جانوروں کے خطرات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ضلع بھر کے تمام امور متعلقہ مال و پولیس کے لئے۔ دفتر ضلع میں کلرکی کے لئے۔	جناب ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر ضلع.....
٩- آبیانہ کی کمی بیشی اور معافی وغیرہ کیلئے ماتحت عملہ محکمہ نہر کے خلاف شکایات۔	جناب مہتمم صاحب بہادر انہار ڈویژن....
١٠- ہسپتالوں کے انتظام کی خرابی اور حصول تاریخ پیدائش کے لئے۔	جناب سول سرجن صاحب بہادر ضلع....
١١- دیہات کی صفائی نہ ہونے یا وباؤں کی روک تھام کے لئے۔	جناب ڈسٹرکٹ ہیلتھ افسر صاحب ضلع....

علاوہ ازیں کئی دیگر محکمہ جات ہیں جن سے متعلق امور کیلئے انکی خدمت میں درخواست کرنی چاہئے +

مضمون نویسی

مضامین کو عموماً دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) علمی و اخلاقی مضامین۔ (۲) مناظر یا تقریبات کے کوائف۔

علمی و اخلاقی مضامین میں جغرافیہ۔ تاریخ۔ سائنس۔ ریاضی۔ نجوم۔ ہندسہ۔ زراعت۔ تجارت۔ ملازمت۔ صنعت۔ حکمت۔ عدالت۔ محبت۔ غصہ۔ خودداری۔ مطالعہ نفس وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔

اور مناظر یا تقریبات میں دریا۔ پہاڑ۔ صحرا۔ اور کھیتوں وغیرہ کی سیر۔ میلے اور دیگر تیوہار شامل ہیں۔

مضامین خواہ کسی قسم کے ہوں۔ ان کے متعلق کچھ لکھتے وقت مندرجہ ذیل ہدایات پر کاربند ہونا چاہیئے:۔

(۱) غیر ضروری تمہید یا تعارف سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اکثر طلباء خواہ مخواہ لمبی چوڑی تمہیدیں لکھ کر وقت اور کاغذ ضائع کرتے ہیں۔ اصل مضمون یا کام کی باتیں بہت تھوڑی لکھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے بہت کچھ لکھ ڈالا ہے۔ یاد رہے۔ کہ ایسی بے مطلب تحریروں کا کوئی نمبر انہیں نہیں ملتا۔ اور نتیجہ کے طور پر وہ فیل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دریا کی سیر پر مضمون لکھنا ہے۔ اور وہ لکھتے ہیں۔

اتوار کی چھٹی تھی میں ابھی سویا ہوا تھا۔ کہ کسی نے آکر دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ میں آواز سن کر اٹھا۔ باہر آیا کہ دیکھوں کون ہے۔ دروازہ کھولا تو میرا دوست حمید باہر کھڑا تھا۔ میں اُسے اندر لے آیا۔ بٹھایا اور خود ضروری حاجات سے فارغ ہونے کے لئے غسل خانہ کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر آیا اتنے میں چائے تیار ہو گئی تھی۔ میں نے حمید کے سامنے چائے رکھی اور ہم دونوں

نے پی۔ پھر اُس سے آنے کا سبب پوچھا تو اُس نے کہا آج چھٹی کا دن ہے۔ آؤ سیر کو چلیں ہمیں رضامند ہو گیا اور قرار پایا کہ انور اور محمود کو بھی ساتھ لے لیں۔ چنانچہ ان کے مکانوں پر جا کر انہیں بھی ساتھ لیا اور پھر تانگہ کی تلاش میں اڈے پر گئے .... وغیرہ۔

جاننا چاہئے کہ یہ تمام عبارت فضول ہے۔ صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ چھٹی کا دن تھا۔ ہم دو چار دوست مل کر دریا کی سیر کو گئے اور اس کے بعد سیر کا حال لکھنا چاہئے۔

یا مثلاً کسی شخص کی سوانحعمری لکھنا مطلوب ہے۔ تو اس کے وطن کے متعلق ہی تمہید کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا غیر ضروری ہوتا ہے۔ جیسے کوئی سکندر اعظم پر مضمون لکھنا چاہئے تو اس کی ابتداء یوں کرے۔

برِ اعظم یورپ کے جنوبی حصہ میں تین بڑے جزیرہ نما ہیں۔ جن میں سے ایک یونان ہے۔ یہ ملک ٹرکی کے مغرب میں اور اٹلی کے مشرق میں واقع ہے۔ آب و ہوا معتدل ہے۔ بحیرہ روم کے خطہ میں واقع ہونے کے سبب پھلوں کی پیداوار زیادہ ہے۔ یہاں کے لوگ بُت تراشی اور حکمت و فلسفہ کے نامی استاد ہو گزرے ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں سکندر نامی ایک بادشاہ ہو گزرا ہے .... وغیرہ۔

یہ سب تمہید بے مطلب ہے۔ صرف یوں لکھنا کافی ہے۔ سکندر اعظم یونان کا مشہور بادشاہ ہو گزرا ہے۔

(۲) ایسے مضامین جن میں نفع یا نقصان کے پہلو واضح کرنے ہوں۔ ان میں ایک ترتیب قائم کرنی چاہئے۔ اور علمی یا اخلاقی نفع یا نقصان۔ مالی نفع یا نقصان۔ ملکی نفع یا نقصان کے عنوان قائم کر کے ہر عنوان کے

ماتحت وہ امور لکھنے چاہئیں جو اس میں آتے ہوں۔ اس طرح کوئی ضروری بات بھی باقی نہ رہے گی۔ اور مضمون بھی مربوط اور مکمل ہو جائیگا جو اہل قلم اس طرح ترتیب قائم نہیں کرتے ان کے مضامین بے ربط ہوتے ہیں۔ مثلاً قرض کی خرابیاں لکھتے وقت وہ لکھتے ہیں۔

قرض بُری بلا ہے۔ خدا اس سے بچائے۔ تمام جائداد تباہ ہو جاتی ہے۔ مقروض جھوٹ بولنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ جو کچھ کماتا ہے۔ سود کی نذر کر دیتا ہے۔ قرض کے بوجھ تلے جو قومیں دب جاتی ہیں۔ وہ غلام بن جاتی ہیں قرض خواہ کے سامنے مقروض کی کوئی رائے نہیں رہتی۔ وہ شرمندہ ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ۔

دیکھئے کیسا بے ربط مضمون ہے۔ پس ہر مضمون کے عنوان قائم کر کے اُن میں ربط پیدا کرنا چاہیئے۔

(۳) بعض علمی اور اخلاقی مضامین ایسے ہوتے ہیں۔ جن کی توضیح کے لئے کوئی کہانی یا تاریخی واقعہ لکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً سچ کی تاثیر کے لئے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے سفر کا واقعہ اور ہمت نہ ہارو کے مضمون میں ایسے فاتحین کی مثالیں جنہوں نے متواتر شکستیں کھانے کے بعد آخر فتح حاصل کی۔ تو انہیں حسب ضرورت مختصر طور پر لکھو یا صرف ان کی طرف اشارہ ہی کر دو۔ سارا قصّہ یا واقعہ لکھنے سے مضمون خواہ مخواہ طویل ہو جائے گا اور اصل مطلب بیان کرنے کی گنجائش کم رہے گی۔

(۴) علمی و اخلاقی مضامین کے خاتمہ پر ایک مفید نتیجہ اگر لکھا جائے تو مضمون کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ پس کوشش کرنی چاہیئے کہ ہر مضمون کے آخر میں کوئی سبق لکھ دیا جائے۔

(اس امر کی مثالیں ان نمونہ کے مضامین میں لکھ دی گئی ہیں۔ جو اس کتاب میں درج ہیں۔)

(۵) مضمون کو ہمیشہ شاندار فقرات سے شروع کرنا چاہیئے خواہ وہ فقرات تمہیدی ہوں یا اصل مضمون ہوں۔ اس سے پڑھنے والے پر اچھا اثر پڑتا ہے اور مضمون نگار کے متعلق وہ ایک اچھی رائے قائم کر لیتا ہے۔ پھر مضمون کے اندر اگر کسی جگہ رنگ پھیکا بھی پڑ جائے تو گزارہ ہو جاتا ہے۔

اور اسی طرح مضمون کے خاتمہ کو ایسے فقرات سے مزیّن کرنا چاہیئے جس سے پڑھنے والا ایک خاص اثر قبول کرے۔ اور جہاں تک ہو سکے محاورات اور ضرب الامثال سے مضمون کو آراستہ کرنا چاہیئے۔

(۶) عام خیالات دماغ میں جمع کر کے مضمون کو لکھنا چاہیئے۔ تاکہ کوئی خامی نہ رہ جائے۔

اب ہم نمونہ کے طور پر چند مضامین لکھتے ہیں۔ تاکہ طلباء اندازہ کر سکیں کہ کوئی مضمون کس طرح لکھا جاتا ہے۔

۱۔ وقت کی پابندی

وقت کی پابندی کے لحاظ سے لوگوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہیں جو جلد باز ہیں اور کام کو وقتِ مقررہ سے پہلے کر لینا چاہتے ہیں۔ دُوسرے سُست ہیں جو کام کو وقت پر نہیں کرتے اور دیر لگا دیتے ہیں۔ اور تیسرے وہ ہیں جو کام کو وقت پر کرتے ہیں۔

جلد باز آدمی کا حال اس لڑکے کا سا ہے۔ جو ابھی گھٹنوں کے بل چلنا

سیکھا ہو اور چاہے کہ کھڑا ہو کر دوڑے۔ ظاہر ہے کہ وہ کھڑا ہوتے ہی گر پڑیگا کیونکہ وقت کے لحاظ سے وہ ابھی چلنے اور دوڑنے کے قابل نہ تھا۔ اسی طرح جلد باز ہمیشہ نقصان اُٹھاتا ہے۔ وہ فصل اور پھل پکنے سے پہلے انہیں توڑ کر فروخت کرنا چاہتا ہے۔ اور خیال کرتا ہے۔ کہ اس طرح زیادہ قیمت وصول ہوگی مگر جنس خام ہونے کے سبب اس کے دام کم ملتے ہیں۔ اسی طرح وہ ہر کام وقت سے پہلے ختم کرکے چاہتا ہے۔ کہ دوسروں سے گوئے سبقت لے جائے۔ لیکن جلدی کا کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ یا اتنا اچھا نہیں ہوتا۔ جس کی تعریف کی جائے۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ کہ تعجیل کارِ شیاطین بود۔ (جلد بازی کرنا شیطان کا شیوہ ہے۔)

اسی طرح سُست آدمی کام کو وقت پر نہیں کرتا اور آج کا کام کل پر ڈالتا رہتا ہے۔ اور اس کا حال اس کسان کا سا ہوتا ہے جو پکی ہوئی فصل کے کاٹنے میں دیر کرے۔ ظاہر ہے کہ پکے ہوئے خوشے دیر تک شاخوں کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ وہ خود بخود گر کر پیوندِ زمیں ہو جائیں گے۔ اور سُست آدمی فصل کی پیداوار ضائع کرے گا۔ اور پھر پچھتائے گا۔ مگر

اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت

پس بہتر لوگ وہ ہیں جو کام کو وقت مقررہ پر کرتے ہیں اور آج کا کام کل پر نہیں ڈالتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قانونِ قدرت کے پابند کہنا چاہئے۔ کیونکہ دُنیا کے کارخانے کو چلانے کے لئے خدا نے جو شے بنائی ہے وہ وقت کی پابند نظر آتی ہے۔ سُورج کا طلوع و غروب۔ چاند کا کمال و زوال۔ زمین کی گردش اور موسموں کا تغیر و تبدل۔ اجناس کی پیداوار اور جانداروں کی پیدائش وغیرہ کو دیکھیں کوئی شے بھی اپنے وقت سے پہلے یا پیچھے ظاہر نہیں

ہوتی۔ اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ کُلُّ اَمْرٍ اَمْرٌ مَرْهُوْنٌ بِاَوْقَاتِهَا۔ گویا قدرت کے تمام کام وقت مقررہ پر ہوتے ہیں۔ جس کی تائید مزید قرآن کی اس آیت سے ہوتی ہے۔ اِذَا جَاءَ اَجَلُہُمْ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ مِنْہُ سَاعَۃً وَّلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ۔

قدیم یونانی بُت پرستوں نے وقت کی ایک تصویر بنائی تھی۔ جو اب بھی وہاں کے عجائب گھر میں دیکھی جاتی ہے۔ یہ ایک نوجوان لڑکے کی تصویر ہے جس کے دو پر ہیں۔ ایک ہاتھ میں درانتی ہے۔ اور چوٹی کے بال ماتھے پر رکھے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت ہمیشہ جوان ہے۔ اُڑتا جا رہا ہے۔ گویا تیزی سے گزرتا جاتا ہے۔ اور لوگوں کی کشتِ امید کو کاٹتا جاتا ہے۔ اگر کوئی اسے پکڑنا چاہے تو ماتھے کے بالوں سے پکڑے۔ یعنی وقت آنے سے پہلے کام کی تیاری کرے ورنہ "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"۔

پس قدرت کے منشا کے مطابق ہمیں وقت کا پابند ہونا چاہیئے۔ ہر کام کے لئے وقت مقرر کرنا چاہیئے اور پھر اُسے وقتِ مقررہ پر پورا کرنا چاہیئے۔ کیونکہ زندگی میں بہت سے کام درپیش ہیں۔ اگر ایک ہی کام میں لگے رہیں تو باقی کام نہ ہو سکیں گے۔ اور اگر کام کے لئے وقت کا خیال نہ رکھا تو بے وقت کی شہنائی بجانے سے ندامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لڑکپن کا زمانہ علم حاصل کرنے اور کوئی ہُنر سیکھنے کے لئے ہے۔ اسے تحصیلِ علم و فن میں لگانا چاہیئے تاکہ جب جوان ہو کر دُنیا کے کاروبار میں لگیں تو معاشرت کا سامان حاصل کر سکیں پھر جوانی کا زمانہ بھی کسی فن میں کمال حاصل کرنے کا زمانہ ہے۔ اور

دو دن کی زندگی کا نہیں اعتبار کچھ + وہ کام کیجئے کہ رہے یادگار کچھ

اگر ان دنوں میں کچھ نہ کیا تو پھر زندگی اکارت جائے گی۔ جو نہ اپنے لئے مفید ہوگی اور نہ دوسروں کے لئے۔

طالب علموں کے لئے وقت کی پابندی بے حد ضروری ہے۔ سکول میں وقت پر جانا۔ پڑھنے کے وقت پڑھنا اور کھیلنے کے وقت کھیلنا چاہیئے۔ تاکہ تعلیمی ترقی کے ساتھ جسمانی نشوونما بھی ہوتی رہے۔ گھر پر کام کرنے کے لئے بھی ہر کام کا وقت مقرر کرنا چاہیئے۔ کسی ایک مضمون کے لئے زیادہ محنت کرنا اور دُوسرے مضامین کو نظر انداز کرنا فائدہ مند نہیں ہوتا۔ تفریح اور دوستوں اور رشتہ داروں سے میل ملاپ کے لئے بھی اوقات کا تعیّن بہت ضروری ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے اطلاع دیئے بغیر اُن کے گھر چلے جاتے ہیں۔ وہ خود بھی تکلیف اٹھاتے ہیں اور رشتہ داروں اور دوستوں کی پریشانی کا سبب بھی بنتے ہیں۔ اور خِفّت اٹھاتے ہیں۔ ملکی نظم و نسق کو قائم رکھنے اور بہتر بنانے کے لئے بھی وقت کی پابندی لازمی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے دفتروں۔ عدالتوں اور سکولوں کے لگنے کے اوقات مقرر ہیں۔ ریل ڈاک اور تار گھر وغیرہ کے اوقات مقرر ہیں۔ ان اوقات میں ہی ان اداروں کے کاروبار ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنی مرضی سے ان میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اور ان اوقات کی پابندی نہ کرنے والا شخص قانون کی خلاف ورزی کر کے نقصان اٹھاتا ہے۔ پس ہر کام کا وقت مقرر کرنا چاہیئے۔ اس میں جلد بازی یا سستی نہیں کرنی چاہیئے۔ اور یاد رکھنا چاہیئے کہ

اَلتَّعْجِیْلُ مِنَ الشَّیْطَانِ وَالتَّاجِیْلُ مِنَ الرَّحْمٰنِ

۲۔ علم

عِلم کے لغوی معنے جاننا ہے۔ اور عرفِ عام میں پڑھنے لکھنے کی قابلیت کو علم کہتے ہیں۔

علم وہ فضیلت ہے۔ جس سے انسان نے اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل کیا ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے سب سے پہلے خدا تعالیٰ نے اُسے علم پڑھایا۔ جس سے اس کا شرف اور رتبہ بڑھ گیا۔ اور فرشتوں نے اُسے سجدہ کیا۔

اور یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ علم کے بغیر انسان اور حیوان برابر ہیں۔ بلکہ انسان حیوانوں سے بدتر ہے۔ کیونکہ انسان کو جو عقل و شعور خدا نے بخشا ہے۔ وہ حیوان کو نہیں دیا۔ اور عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ علم حاصل کرے ورنہ کہنا پڑے گا کہ اس نے ایک نعمت کو ضائع کیا۔ اور حیوانات سے بدتر ہو گیا۔ کیونکہ وہ اپنے شعور سے پورا کام لیتے ہیں۔ اگر انسان عقل سے علم حاصل نہ کرے تو اُن سے بُرا ہے۔ یہ علم کا فیض ہے۔ کہ آدم اور اُس کی اولاد نے زمین کو آباد کیا۔ زمین سے پیداوار حاصل کر کے خوراک۔ لباس اور آرام و آسائش کے سامان بہم پہنچائے۔ تہذیب و تمدن کی راہیں نکالیں اور خلافت الٰہی کا منشا پورا کیا۔

خدا تعالےٰ کا یہ فیض بڑھتا چلا گیا۔ اور روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ جس سے انسان اس حد تک ترقی کر گیا ہے کہ علمی کارناموں سے کائنات کا ذرہ ذرہ چمک اٹھا ہے۔ اور علم کی برکت سے انسان نے ایسی ایجادات کر دکھائی ہیں جن کو بے علم آدمی دیکھتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اہلِ علم انسان (ہوائی جہازوں کے ذریعے) ہوا میں اُڑتا جا رہا ہے (آبدوز کشتیوں سے) سمندر کی تہ میں تیر رہا ہے۔ (عام بحری جہازوں سے) سمندر پر چل رہا ہے۔ (دُوربینوں سے) آسمانی ستاروں کے حالات مطالعہ کر رہا ہے اُس نے اپنے علم سے زمین کی نچلی تہوں میں چھپے ہوئے خزانے معلوم کر لئے

ہیں۔ معدنیات کو تصرف میں لاکر اور اربعہ عناصر کو ملاکر کہیں انجن اور کلیں چلادی ہیں اور کہیں بجلی پیدا کر کے تار سے خبر رسانی کے سلسلے قائم کر لئے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ ہزاروں میل کے فاصلے پر ایک شخص باتیں کر رہا ہے۔ اور بغیر کسی تار کے سلسلے کے وہ باتیں اُسے سُنائی دیتی ہیں تو ان چیزوں کو انسانی معجزات سمجھتا ہے۔

پس علم کو ایک نُور کہنا چاہئے۔ جس سے جہالت کے اندھیرے دُور ہو جاتے ہیں۔ عقل و شعور ترقی پاتے ہیں۔ نیکی اور بدی کا امتیاز ہوتا ہے۔ اخلاق سنورتے ہیں۔ دُنیا و مافیہا کی ماہیت دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ انسان اپنی ہستی پر غور کرتا ہے۔ اور پھر کائنات کے مربوط نظام کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ اور اپنے مشاہدہ و مطالعہ کی ترقی سے وہ اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ کہ ان تمام مرئی و غیر مرئی اشیاء اور قوتوں کا پیدا کرنے والا کوئی ہے۔ اور اس طرح وہ خدا کی ذات و صفات کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ کہ "بے علم نتواں خدا را شناخت"۔

انسان مدنی بالطبع ہے۔ یعنی دُنیا میں وہ اکیلا نہیں رہ سکتا اور نہ اُسے اکیلا رہنے کے لئے خدا نے پیدا کیا۔ پس باہمی میل جول سے زندگی بسر کرنے کے طریقے اسے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ جو علم کے بغیر اُسے نہیں آتے۔ خانہ داری کے فرائض اور ان کی بجا آوری۔ مجلسی زندگی کے آداب اور ملکی نظم و نسق کے قواعد وغیرہ ساری باتیں علم کی محتاج ہیں۔ محبت۔ صداقت۔ عدل و انصاف۔ رواداری۔ رحمدلی۔ شفقت وغیرہ اخلاق حمیدہ علم سے پیدا ہوتے ہیں۔ غصہ۔ قہر۔ حرص۔ حسد وغیرہ کی اصلاح علم سے ہوتی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ علم سے محض نفسِ انسانی کو کمال حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ معاشرت

کے لئے ہر قسم کی آسائش بھی علم سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ ایک علمِ زراعت کا عالم جدید آلاتِ کشاورزی کے استعمال اور کاشت کے طریقوں سے واقف ہونے کے سبب زمین سے جس قدر پیداوار حاصل کرتا ہے۔ بے علم آدمی اُس کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہیں کرسکتا۔ حال ہی میں ایک عینی شاہد نے مجھے بتایا کہ اُس نے امریکہ کے سفر کے دوران میں وہاں کے باغات کی سیر کی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک ہی درخت میں اس موسم کے تمام پھل لگے ہوئے ہیں ماہرین نے درخت کے مختلف ٹہنیوں پر مختلف درختوں کا پیوند لگا دیا اور مختلف پھل حاصل کر دیئے۔

اسی طرح ایک پڑھا لکھا آدمی تجارت کا کام جس خوش اسلوبی سے کر سکتا ہے۔ ان پڑھ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ جب تک علمِ حساب سے بہرہ ور نہ ہو کوئی شخص خرید و فروخت کے نفع و نقصان کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ اور اپنے حسابات نہیں رکھ سکتا۔ اسی طرح دیگر پیشوں کے لئے بھی علم کی بیحد ضرورت ہے۔ گویا فنون کی تکمیل علم کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اور معماری۔ مصوری۔ بُت تراشی وغیرہ فنون بھی علم کے بغیر ناقص رہتے ہیں معاشی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے ملازمت کا پیشہ سب سے گھٹیا شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن آجکل اس کے لئے بھی اعلیٰ تعلیم درکار ہے۔ اور ان پڑھ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ پس یوں کہنا چاہیئے کہ دولت کمانے کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ بلکہ علم ہی ایک خزانہ ہے۔ جو بڑھتا رہتا ہے۔ اور خرچ کرنے سے گھٹتا نہیں۔ ملکی نظم و نسق یعنی ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لئے آئین وضع کرنا امن قائم رکھنے اور ترقی کے وسائل بہم پہنچانا۔ ہمسایہ قوموں سے ربط بڑھانا حفاظت اور مدافعت کے لئے اسلحہ اور دیگر سامان کی فراہمی وغیرہ سب امور

علم سے درست ہوتے ہیں۔ علمی خزانوں کے مالک اپنی آزاد حکومت بناتے ہیں۔ اور اُسے قائم رکھتے ہیں۔ جاہل لوگ ہمیشہ غلامی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ جس ملک میں علم نہیں وہ ڈھوروں کا جنگل ہے۔ علم کے متعلق بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو روحانی اور جسمانی ترقی کرنے خوشحالی اور آزادی سے زندگی گزارنے اور خدا تعالیٰ کے منشا کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ علم سے بہرہ ور ہو۔ اسی لئے شارع علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ "اُطْلُبُوا الْعِلْمَ لَوْ کَانَ بِالصِّیْنِ"۔ (علم حاصل کرو خواہ چین کے ملک میں جانا پڑے) یعنی علم حاصل کرو خواہ اس کے لئے کتنا دُور کا سفر طے کرنا پڑے۔

۳۔ مذہب

تعریف۔ مذہب سے وہ چند قواعد و ضوابط مراد ہیں۔ جن کی پابندی سے نفسِ انسانی کمال حاصل کر سکے۔

ضرورتِ مذہب۔ کمال نفسِ انسانی سے دو قسم کے فائدے متصور ہیں۔ ایک تو اُس کی اپنی ذات کے لئے اور دُوسرے جُملہ کائنات کے لئے جو اس کی ذات سے عالمِ موجودات کو حاصل ہوں۔ اور پھر ذاتی کمال کے لئے دُنیا کی باقی اشیاء سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ اور مخلوقات سے میل ملاپ کے بغیر نفسِ انسانی کما حقہٗ کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے ایسے قواعد کا وضع کرنا ضروری ہے۔ جو نفسِ انسانی کو مؤثر بنا کر اور ماحول سے متأثر کر کے اس حقیقی کمال کی طرف لے جائیں جو بقدر طاقت بشری اُس کے شایانِ شان ہے۔

اصولِ مذہب - ممکن ہے بعض حضرات مذہب کی اس انوکھی تعریف پر ناک بھوں چڑھائیں کیونکہ عوام کے نزدیک مذہب سے مراد "ایک حاجت روا کی پرستش" ہے جس نے خدا کو حاجت روا مانا وہ خدا پرست ہوا - اور جس نے آگ کو حاجت روا جانا وہ آتش پرست کہلایا - بتوں سے مرادیں مانگنے والا بت پرست بنا اور جس نے مادہ کو فعال حقیقی سمجھا وہ دہریہ یا مادہ پرست کے نام سے مشہور ہوا وغیرہ - اور اسی خدا پرستی - آتش پرستی - بت پرستی اور مادہ پرستی کو مذہب کہا گیا - لیکن معترض حضرات ذرا دیکھیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ یہ خدا پرست - آتش پرست - بت پرست اور مادہ پرست وغیرہ مذاہب نے اپنے پیروؤں کے لئے علیحدہ علیحدہ چند قواعد و ضوابط پیش کر رکھے ہیں - اور ان میں سے ہر ایک کا یہ دعوی ہے کہ انہی اصولوں پر کاربند ہو کر نفسِ انسانی کمال حاصل کر سکتا ہے - اس سے ثابت ہوا کہ حاجت روا کی پرستش کا امتیاز مذہب کا نام رکھنے کے لئے مناسب تجویز ہے - اور ان ناموں سے مذاہب کا امتیاز ہو جاتا ہے - مگر مذہب سے مراد وہی اصول ہیں - جن کا اوپر ذکر ہوا اور معبود کا تعین تزکیۂ نفس کی ایک راہ پیدا کرنے کے لئے ہے - اور بس -

اب ان اصولوں کا جاننا ضروری ہے جو مذہب کے لئے ضروری ہیں - اور ان کے دو حصے کئے جاتے ہیں -

ایک وہ اصول ہیں جو مجلسی زندگی میں افراد کے حقوق کی حفاظت کرتے ہیں اور ان میں آداب مجلس - حقوقِ ملکیت اور ارتقائے تمدن کے امور شمار کئے جاتے ہیں اور اُن سے غرض یہ ہوتی ہے - کہ ابنائے جنس میں باہمی ربط ضبط قائم کیا جائے - امن قائم رکھا جائے - ہر فرد کے حقوق کی حفاظت کی جائے - کسی پر سختی اور ظلم نہ کیا جائے - قانون شکنی کرنے والوں کو سزائیں دینے کے لئے عدالتیں

قائم کی جائیں۔ ناکارہ اور مفلوک الحال اشخاص کو امداد بہم پہنچانے کے وسائل مہیا کئے جائیں۔ اور غیروں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرنے کی صورتیں تجویز کی جائیں وغیرہ۔ یہی وہ اصول ہیں جو قومی قوانین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ قوانین جس قدر بہتر اور مکمل ہوں گے۔ اسی قدر وہ قوم دنیا میں بہتر اور سرفراز ہوگی اور جس قدر ان قوانین میں خامیاں ہوں گی۔ قوم پستی کی طرف مائل رہے گی۔

اگرچہ یہ مجلسی زندگی کے اصول افراد کے اندر عدالت کا ملکہ پیدا کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ اور فی الواقع ان کی پابندی سے نفسِ انسانی بے حد متأثر ہو کر صراطِ مستقیم کی طرف رجوع کرتا ہے۔ لیکن تزکیہ نفس کے لئے کچھ اور باتوں کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اور گو وہ باتیں ساری قوم کے لئے ویسی ہیں جیسی فرد کے لئے۔ لیکن ان کی پابندی سے افراد کمال حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کی عدم پابندی قومی ترقی کے لئے مانع نہیں ہوتی۔ پس ان مذہبی اصولوں کا دُوسرا حصّہ وہ ہے۔ جو محض اخلاق سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ان میں ازدواجی زندگی کے قواعد اور نفس کو مطمئن کرنے والے امور ہوتے ہیں۔ جن کے ضمن میں حلال و حرام کی بحث خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اور پھر سکونِ قلب کے لئے ایک حاجت روا کو ماننا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہی وہ اصول ہیں جن کو عام طور پر مذہبی اصُول کہا جاتا ہے۔ اُن اصولوں کی بنیاد وہ غور و فکر ہے جو انسان اپنی ہستی کے متعلق کرتا ہے۔ اور طبعًا یہ سوچنے پر مجبُور ہے۔ کہ وہ کس طرح عالمِ وجود میں آیا۔ دُوسری مخلوق کس طرح پیدا ہوئی۔ میرے پیدا ہونے کی غرض کیا ہے۔ اور اس وجود کا انجام کیا ہوگا۔

ان سوالات کے جوابات جو کچھ بانیانِ مذاہب نے لوگوں کو بتائے وہی مذہب کے نام سے مشہور ہُوئے اور اسی غور و فکر سے بعض نے خدا کی ہستی

کا اقرار کیا اور تخلیق و ربوبیت وغیرہ کی تمام صفات اسی سے متصف کر دیں - اور یہ بھی بتایا کہ زندگی لہو و لعب کے لئے نہیں بلکہ آفرینش عالم کی دیگر اشیاء کو کام میں لا کر انہیں مفید خلاق بنانا اس کا منشا ہے نیکی اور بدی کا معیار مقرر کیا گیا اور بتایا گیا کہ اس زندگی کی نیکیوں اور بدیوں کا حساب اسی خالق کے دربار میں دینا ہوگا - اور موت کے بعد ایک دن یوم حساب ہوگا - لیکن بعض نے ان سوالات کے کچھ اور جواب دیئے -

اب یہ سوچنا ہمارا فرض ہے کہ کونسے جوابات قابلِ قبول اور صحیح ہیں - اور کونسے غیر تسلی بخش ہیں - اس معاملہ میں اندھا دھند تقلید یقیناً جائز نہیں اور فی زمانناعلوم کی ترقی سے انسان کی فہم و فراست اور عقل اس درجہ تک پہنچ چکی ہے - کہ بغیر دلیل کے کسی بات کو بیان کرنا دیوانگی خیال کیا جاتا ہے پس فلسفہ اور سائنس کی کسوٹیاں ہماری رہنمائی کے لئے کافی ہیں - اپنے اصولِ مذہب کا فلسفہ سمجھیں اگر واقعات اور دلائل کے لحاظ سے وہ اصول صحیح ہو تو اس کی پابندی کریں ورنہ اُسے چھوڑ دیں - یہی وہ چیز ہے - جس پر تمام مذاہب زور دے رہے ہیں -

خدا کا شکر ہے کہ جوں جوں مذہبی اصولوں کے فلسفے پر بحثیں ہوتی ہیں - قدرتی اور فطری مذہب اسلام کی حقانیت ثابت ہوتی جاتی ہے - خدا تعالےٰ ہر کسی کو یہ توفیق بخشے کہ وہ اصولِ مذہب کا فلسفہ سمجھے -

خدا نے چاہا تو کسی دوسرے مضمون میں فلسفہٴ اسلام بیان کروں گا -

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ +

۲۴۔ دریا کی سیر

چھٹی کا دن تھا اور موسم نہایت خوشگوار۔ ہم چند دوست علی الصبح دریا کی سیر کے لئے گھروں سے چل کھڑے ہوئے۔ بائیسکلوں پر تین میل کا سفر دیکھتے ہی دیکھتے کٹ گیا اور ہم دریا کے کنارے جا پہنچے۔

سورج ابھی طلوع ہو رہا تھا۔ دریا کی ساحلی زمین پر دور تک سبز گھاس اُگی ہوئی تھی جس پر شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ گھاس کے اندر خودرو جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ ان میں مویشی چر رہے تھے۔ دریا کا کنارہ سطحِ آب سے بہت اونچا تھا۔ اور اگرچہ گرمی کا آغاز ہونے کے سبب پانی میں طغیانی آ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی دریا کنارے سے نیچے بہ رہا تھا۔ دریا میں اُترنے کے لئے چند گھاٹ بنے ہوئے تھے۔ ایک گھاٹ مویشیوں کو پانی پلانے اور نہانے کے لئے تھا۔ ایک کپڑے دھونے کے لئے اور ایک کشتیوں کے ٹھیرانے کا گھاٹ تھا۔ ہم بھی کنارے سے اُترے۔ ایک کشتی کرائے پر لی۔ اور دریا کے اندر سیر کرنے لگے۔ ہمارے چاروں طرف عجیب رونق تھی۔ کہیں مویشی پانی پیتے اور نہاتے تھے۔ کہیں دھوبی کپڑے دھو رہے تھے۔ ایک طرف ماہی گیروں نے جال بچھائے ہوئے تھے۔ تو دوسری طرف شکاری کنڈیاں لگا کر مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ ان سے ذرا دور مرغابیوں کے شکاری بندوقوں کے فائر کر رہے تھے۔ نیز اک دریا میں نہا رہے تھے۔ جو ڈرپوک تھے وہ کنارے پر ہی کھڑے نہاتے تھے۔ اور دلیر بے خطر منجدھار پر جاتے تھے۔

دریا کے بالائی حصّے سے ایک سیاہ ٹیلہ سا بہتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ نزدیک آیا تو معلوم ہوا کہ لکڑیوں کا ایک گٹھا ہے۔ جو پہاڑی علاقہ سے باندھ کر دریا میں

ڈال دیا گیا تھا۔ عمارتی لکڑی پہاڑوں سے اسی طرح میدانی علاقوں میں لائی جاتی ہے۔ ہم کشتی میں بیٹھے چپو چلاتے۔ چھینٹے لڑتے اور لہروں سے کھیلتے ہوئے جب سیر ہو گئے۔ تو واپس کنارے پر آ گئے اور پھر کنارے کے ساتھ ساتھ پیدل چلنا شروع کیا۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ دریا میں بند باندھا ہوا دکھائی دیا۔ یہاں سے دریا کے دونوں طرف دو بڑی بڑی نہریں نکالی گئی تھیں اس بند کے قریب ہی دریا کا پانی ایک طرف کو کاٹ کر نکالا گیا تھا جس پر بجلی پیدا کرنے کا ایک کارخانہ لگا ہوا تھا۔ دریا کا پانی زور سے ٹکراتا اور کلوں کو حرکت میں لاتا تھا۔ اور پھر کلوں سے بجلی پیدا کی جاتی تھی۔ پاس ہی ایک پن چکی لگی ہوئی تھی۔ جو نہی دریا کارخانہ کی خدمت سے فارغ ہوتا۔ چلتے چلتے اس چکی کو بھی چلاتا جاتا تھا۔ بہت سے لوگ آٹا پسوانے کے لئے وہاں جمع تھے۔ اور بجلی کا کارخانہ اور پن چکی ہونے کے سبب وہاں خاصی آبادی نظر آتی تھی گویا جنگل میں منگل لگا ہوا تھا۔ ہم چلتے چلتے ایک میل دور تک چلے گئے۔ اور ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ گئے جو دریا کے کنارے واقع تھا۔ یہاں پہنچ کر ہماری وہ خوشی خاک میں مل گئی۔ جو دریا کی سیر سے حاصل ہوئی تھی۔ عجب دردناک نظارہ تھا۔ دریا نے کنارے کی زمین کو گرانا شروع کیا ہوا تھا۔ لوگ افراتفری کے عالم میں گھروں سے باہر نکل رہے تھے۔ کسی نے چھکڑے پر سامان لاد لیا تھا اور کسی نے سر پر ہی گٹھڑی اٹھائی تھی۔ کوئی چھت اُدھیڑ رہا تھا اور کوئی دروازوں کے کواڑ اتار رہا تھا کہ جلدی جلدی گاؤں سے نکل چلیں۔ پانی تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے گھروں میں گھسا چلا آتا تھا۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بعض مکان جو بظاہر پانی سے ذرا دور تھے دیکھتے ہی دیکھتے چلا کر گرگئے اور پھر وہاں دیکھا تو پانی ہی پانی تھا۔ معلوم ہوا کہ دریا بعض جگہ زمین کے نیچے

ہی نیچے ڈھانے کا عمل کرتا ہے۔ اور جونہی اس کا عمل کارگر ہو جاتا ہے۔ رُوئے زمین کی ہر شئے کو گرا کر پانی میں ڈال لیتا ہے۔ بعض لوگ بھاگ چکے تھے۔ اور بعض ابھی بھاگنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ بچّوں کی چیخ پکار اور عورتوں کا واویلا دلوں کو ہلا رہا تھا۔ کہیں چارپائیاں دریا میں بہ رہی تھیں اور کہیں اناج کی بوریاں غرق ہو رہی تھیں اور کہیں گھروں کے برتن دریا میں تیرتے دکھائی دیتے تھے۔ خلقِ خدا سراسیمہ تھی۔ ہم اس دردناک نظارہ سے بہت متاثر ہوئے اور مَیں نے دریا سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے ظالم ان لوگوں نے تیرا کیا بگاڑا تھا کہ تُو نے انہیں اس طرح تباہ و برباد کیا۔ ان پر رحم کر اور پرے ہٹ جا۔ میرا یہ عتاب آمیز سوال سُن کر دریا یُوں گویا ہُوا:۔

یہ سُن کے اُس نے فرطِ جوش سے کہا جواب میں
ہے انقلابِ زندگی نہاں کنارِ آب میں
جو آ کے میری لہروں میں کبھی نہ غوطہ زن ہُوا
وُہ دامنِ مراد کو بھرے گا موتیوں سے کیا
یہ مانا میرے پانیوں میں آفتیں ضرور ہیں
مگر جو ڈرتے رہتے ہیں وہ فائدوں سے دُور ہیں
الیکٹرک ہزاروں کارخانوں کو چلاتی ہے
جو بے لگام ہو تو گردوپیش کو جلاتی ہے
یہی ہے میرا خاصہ پستیوں کو مَیں دباتا ہوُں
بلندیوں کے سامنے ہمیشہ سر جھکاتا ہُوں
جو بند باندھ کر مرے بہاؤ کو ہیں روکتے
اُٹھاتے میری سرکشی سے ہیں کثیر فائدے

کنارہ پست ہمتی سے ہی اگر ضعیف ہو
بھے نہ کس طرح مرے بہاؤ میں تمہیں کہو
سپر ہو آدمی ہمیشہ حادثات کے لئے
اسی سے کامیابی ہو گی اُس کی ذات کے لئے
جو زندہ رہنا ہے تو اپنی طاقتوں سے کام لے
زمانہ زور کرتا ہے۔ تو بازوؤں سے تھام لے
یہی ہے ایمن عزیز ترکتاز زندگی
اسی میں ہیں چھپے ہوئے تمام رازِ زندگی

دریا کا یہ سبق آموز جواب سُن کر ہم چُپ ہو گئے اور گاؤں والوں کی بربادی پر افسوس کرتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔

۵۔ سیر وسیاحت

کسی خاص غرض کے ماتحت ایک مقام سے دُوسرے مقام تک جانا سفر کہلاتا ہے۔ اور اگر کوئی خاص مقصد مدِ نظر نہ ہو تو اس طرح جا بجا پھرنا آوارہ گردی کہلاتا ہے۔ آوارہ گردی معیُوب ہے۔ جس کے لئے مہذب ممالک میں سزائیں مقرر ہوتی ہیں۔

سفر مختلف مقاصد کے لئے کیا جاتا ہے۔ اور وہ مقاصد مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں۔

۱۔ تعلقات کیلئے۔ رشتہ داروں سے ملنے جلنے اور اُن کے حالات معلوم کرنے یا ان کی شادی و غمی کی تقریبات میں شامل ہونے کے لئے عموماً سفر کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ عوام الناس کرتے ہیں اور ایسا سفر ہر فردِ بشر کو کرنا پڑتا ہے۔

بلکہ حکومتیں بھی ایسے سفر کے لئے مجبور ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہر سلطنت اپنی ہمسایہ سلطنتوں سے رابطۂ اتحاد بڑھانے اور وہاں کے حالات سے باخبر رہنے اور اپنے پیغامات وہاں تک پہنچانے کے لئے جب ضرورت سمجھتی ہے۔ تو اپنے سفیر دوسری سلطنتوں میں بھیجتی ہے۔

۲۔ حصولِ علم و فن کیلئے۔ کبھی حصول علم کی خاطر سفر کرنا پڑتا ہے۔ اور ایسے سفر کو قدیم الایام سے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور شارع علیہ السلام کا فرمان اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ اس سفر کی شان کو بڑھاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کے ماتحت مسلمانوں نے دُور دراز کے سفر کئے اور علم کے وہ خزانے جمع کر گئے۔ جن سے پھر دُنیا بہرہ اندوز ہوئی۔

آج بھی طالبانِ علم و فن کو ایسے سفر اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ مشرق قریب کے باشندے ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں مغربی ممالک میں جاتے ہیں۔ اور برطانیہ۔ فرانس۔ جرمنی۔ اٹلی۔ امریکہ اور دُوسرے ممالک کے علم و فن کی حقیقت کی سندیں حاصل کر کے آتے ہیں۔ اور پھر ان علوم و فنون سے اپنے ملک و ملّت کی خدمت کرتے ہیں۔ اسی طرح مغربی ممالک کے باشندے مشرقی علوم کے خزانوں سے بہرہ اندوز ہو کر جاتے ہیں۔ اور خُذْ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا كَدَرَ پر عمل کر کے ہمارے تمام محاسن کو انہوں نے اختیار کر لیا۔ ہے۔ اور جو تہذیب ایشیاء کے لئے مایۂ ناز تھی۔ اُسے ہم نے تو گنوا دیا اور مغرب والوں نے اسے اپنا لیا ہے۔

غرضیکہ علوم و فنون کی تحصیل کے لئے ہمیں سفر کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور بدوں سفر کی تکالیف برداشت کئے ہم انہیں حاصل ہی نہیں کر سکتے۔ عام سیر و

سیاحت کی غرض و غایت بھی تحصیل علم و فن ہوتی ہے۔

۳۔ تجارت کیلئے۔ اجتماعی زندگی اس بات کا تقاضا کرتی ہے۔ کہ ہم اپنی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کے لئے نزدیک و دُور مقامات پر جائیں۔ اپنی مصنوعات یا اجناس کو دوسری منڈیوں میں لے جاکر فروخت کریں۔ اور ضروریات زندگی جو وہاں سے میسّر ہوں خرید لائیں۔ اور یہ سفر بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بقائے حیات کے لئے یہ سفر ناگزیر ہے۔

ابتداء میں جب قوموں نے دُنیا میں بڑھنا شروع کیا اور دیکھا کہ کسی ایک مقام پر اُن کی ضروریات زندگی میسّر نہیں آتیں تو انہوں نے اس وطن کو خیرباد کہا اور کسی دُوسرے علاقہ یا مُلک میں جا آباد ہوئیں۔ اور آج بھی ضرورتاً ہر قوم دُوسری قوم کی محتاج ہے۔ کہ اپنی فالتو پیداوار دے کر اس سے اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرے اور اس تجارتی غرض کے لئے سفر کرنا پڑتا ہے۔

۴۔ تبلیغ مذہب کیلئے۔ کبھی مذہب کی اشاعت کے لئے بھی سفر کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا بھر کے مذاہب جس قدر پھیلے۔ سفر کی بدولت پھیلے۔ بُدھ مت کے مبلّغین ہندوستان سے نکل کر برما، چین، جاپان اور تبت تک گئے اور بدھ مت کی اس قدر اشاعت کر گئے کہ آج ان ممالک کی بیشتر آبادی بُدھ مت کی پیرو ہے۔ اسی طرح مسلمانوں نے اعلائے کلمۃ الحق کے لئے کمر باندھی اور بَلِّغُوا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً کا فرمانِ مصطفوی پلے باندھا۔ تو عرب سے نکل کر مشرق و مغرب تک جا پہنچے اور چار دانگ عالم میں نورِ اسلام پھیلا دیا اور اسی طرح عیسائیوں نے آج تک تبلیغی مشن قائم کر رکھے ہیں جو دُنیا کے گوشے گوشے میں عیسائیت کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ مذہب بغیر تبلیغ کے نہیں پھیلتا اور تبلیغ بغیر سفر کے نہیں ہو سکتی۔

۵۔ جنگ کیلئے۔ کبھی کبھی حریص اور جابر بادشاہ اپنی مملکت کی توسیع کے لئے قرب وجوار کے ممالک پر حملے کرتے ہیں۔ چنانچہ سکندرِ اعظم اور نپولین کی فتوحات اسی قسم کی تھیں۔ اور ایسی فتوحات کے لئے سفر کرنا پڑتا ہے۔

اسی سلسلہ میں کبھی دشمن کی مدافعت اور سرکوبی کے لئے سفر کرنا پڑتا ہے۔ اور کبھی کسی ملک کی بغاوت فرو کرنے اور قیامِ امن کے لئے فوجوں کو سفر کرنا ضروری ہوتا ہے۔

سفر خواہ کسی غرض کے ماتحت کیا جائے اس میں تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے۔ کہ اَلسَّفَرُ سَقَرٌ وَ لَوْ کَانَ مِیْلًا۔ کہیں جنگلوں کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ اور کہیں دریاؤں کو۔ کہیں پیدل چلنا پڑتا ہے۔ اور بعض اوقات کھانے پینے کی چیزیں نہیں ملتیں جنگلی جانوروں کا ڈر۔ ڈاکوؤں کا خطرہ اور بھیانک مقامات کا خوفناک منظر وغیرہ بہتیری جانکاہ چیزیں سفر میں پیش آتی ہیں۔ پرانے زمانوں میں تو سفر کرنا واقعی جان کو خطرے میں ڈالنا ہوتا تھا۔ آجکل بہت آسانیاں حاصل ہو گئی ہیں۔ مگر پھر بھی سفر تکلیف سے خالی نہیں ہوتا۔ سفر کی جو تکلیفیں بیان ہوئیں ان کے مقابلے میں سفر کے فوائد بہت زیادہ ہیں۔ اور جن اغراضِ زندگی کے لئے سفر کی ضرورت بیان کی گئی ہے۔ وہ بغیر سفر کے پوری ہی نہیں ہوتیں۔ اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں۔ کہ سفر انسانی زندگی کا جزوِ لاینفک ہے۔ شاید اسی لئے کہا گیا ہے۔ کہ ؎

خانۂ خویش مرد رانبد است | قدرِ مردم سفر پدید کند

مگر سفر کے لئے مندرجہ ذیل ہدایات پر کاربند ہونا ضروری ہے۔

(۱) کسی ملک کا سفر کرنے سے پہلے وہاں کی زبان سیکھنی ضروری ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو کوئی ترجمان ساتھ رکھنا چاہیئے۔ جو وہاں کی زبان سے بھی

واقف ہو اور ہماری زبان بھی جانتا ہو۔ ورنہ گونگے اور بہرے بن کر وہاں دن گزارنے پڑیں گے اور حاصل کچھ نہ ہوگا اور کہنا پڑے گا ؎

زبان ترک من ہندی و من ہندی نمے دانم
چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیاباں را

(۲) اپنی وضع کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ جو لوگ دوسرے ممالک میں جاکر وہاں کے اوضاع و اطوار اختیار کر لیتے ہیں۔ اُن کی حیثیت سوانگ بھرنے سے زیادہ نہیں ہوتی اور ان لوگوں کی نظروں میں ان کی کوئی خاص وقعت نہیں ہوتی جو لوگ اپنے قومی لباس میں سفر کرتے ہیں وہ دوسروں کی نظروں میں ممتاز ہوتے ہیں۔

(۳) سفر کے حالات لکھتے وقت اور نتیجہ نکالتے وقت جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ کسی بات کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کر کے اور واقعات کو منطبق کر کے رائے قائم کرنی چاہیئے۔

(۴) معمولی باتوں کے لئے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ تاریخی یادگاروں کو دیکھنے، مشاہیر سے ملنے اور اپنے مدعا کی تکمیل کے لئے اوقات کو صرف کرنا چاہیئے۔

۶۔ قرض کی خرابیاں

کسی شخص سے نقد روپیہ یا کوئی جنس اس شرط پر لینا کہ کچھ عرصہ کے بعد واپس کر دی جائیں گی۔ قرض کہلاتا ہے۔ اور اس نقدی یا جنس کے استعمال کا اگر کوئی معاوضہ مقرر کیا جائے تو اُسے سُود کہتے ہیں۔ جس حساب سے سود دیا جاتا ہے۔ اسے شرح اور جس عرصہ کے لئے کوئی رقم قرض لی جائے

اسے مدت کہتے ہیں۔ اور جو رقم قرض پر لی جائے وہ اصل زر کہلاتی ہے۔ قرض لینے والا مقروض کہلاتا ہے۔ اور جس سے قرض لیا جائے اُسے قرضخواہ کہتے ہیں۔ مذہب اسلام میں سود لینا یا دینا حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور بغیر مقررہ معاوضہ کے قرض لینا یا دینا قرض حسنہ کہلاتا ہے۔ قرض حسنہ معیوب نہیں بلکہ ہمدردیٔ بنی نوع کے لئے ایسا قرض دینا کارِ ثواب ہے۔ ایسے قرض کی ادائیگی کے وقت قرضخواہ کو اظہارِ شکریہ کے طور پر کچھ دے دینا جائز ہے۔ قرض کی ضرورت عام طور پر ایسے شخص کو پڑتی ہے۔ جس کی آمدنی سے اخراجات بڑھ جائیں یا ناگہانی خرچ آ پڑیں مثلاً زمیندار کو کوئی بیل خریدنا پڑ جائے یا مکان گر جائے اور اس کی تعمیر کرنی پڑے۔ یا کسی اور تعمیری پروگرام کے لئے روپے کی ضرورت لاحق ہو تو خواہ مخواہ قرض لینا پڑتا ہے۔ لیکن قرض خواہ کسی حالت میں لینا پڑے مفید نہیں اور خصوصاً سود پر قرض لینا زیادہ خرابی کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ مقروض میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو قرض خواہ کے سامنے حقیر خیال کرتا ہے۔ اور اس کا یہ احساس اتنا بڑھ جاتا ہے کہ قرض خواہ کے سامنے جانے سے کتراتا ہے۔ اور اگر کسی مجلس میں اسے قرضخواہ کے ساتھ بیٹھنے کا اتفاق ہو تو قرضخواہ کی رائے کے خلاف کوئی بات نہیں کہتا۔ گویا اس کی آزادیٔ رائے سلب ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں جب کبھی وقت مقررہ پر قرض ادا نہ کر سکے تو وعدہ خلافی کے سبب بے اعتبار سمجھا جاتا ہے اور پھر وعدے کرتا ہے۔ اور بار بار کے وعدوں سے وہ جھوٹ بولنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ ادھر قرضخواہ بار بار تقاضا کرتا ہے اور مقروض پریشان ہو جاتا ہے۔ اور قرض کی ادائیگی کی تدبیریں سوچتا ہے۔ کبھی خیال کرتا ہے کہ کسی

شخص کی کوئی چیز ہتھیا لے یا نقب لگا کر کسی مکان سے نقدی چرا لے اور کبھی جوئے کھیلنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور ان افعالِ قبیحہ میں سے کسی ایک کا مرتکب ہو کر اپنی اخلاقی زندگی کو ختم کر دیتا ہے۔ اور اگر کوئی اور صورت قرض کی ادائیگی کی نہ ہو تو زیور اور مکان فروخت کرتا ہے۔ یا اجناس بیچتا ہے۔ تاکہ قرض کی مصیبت سے نجات پائے۔ اس طرح اثاث البیت سے ہاتھ دھو لیتا ہے۔ اور اس کے پاس کھانے پینے کے لئے بھی کچھ نہیں رہتا فاقہ کشی کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ اور اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے لئے تباہی کا موجب بنتا ہے۔

ایسے قرض کی حالت میں مقروض کے دل سے قرضخواہ کی محبت ختم ہو جاتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ اَلْقَرْضُ مِقْرَاضُ الْمُحَبَّتِ۔ بعض دفعہ مقروض بددعائیں کرنے لگتا ہے کہ خدایا قرضخواہ مر جائے۔ اور مجھ سے قرض طلب نہ کرے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قرضخواہ کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور جوشِ دیوانگی میں اسے قتل کر کے خود پھانسی کی سزا پاتا ہے کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے۔ کہ مقروض نے قرض سے نجات حاصل کرنے کے لئے خودکشی کر لی۔ خود حرام موت مرا اور لواحقین کو مصیبت میں ڈال گیا۔ بہر حال قرض ایک لعنت ہے۔ خدا اس سے محفوظ رکھے۔ اس کا اثر افراد سے گزر کر جب قوم پر پڑتا ہے۔ تو قوم تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اور جو سلطنتیں دوسری حکومتوں سے قرض لے کر اپنے ملک کے کاروبار اور صنعتوں کو فروغ دینا چاہتی ہیں۔ وہ بہت جلد زوال پذیر ہو جاتی ہیں۔ ان کی ملکی پیداوار قرض کے سود کی نذر ہوتی رہتی ہے۔ اور رعایا کو اپنی ملکی پیداوار بھی مہنگی خریدنی پڑتی ہے۔ اور بعض اوقات اجناس کا قحط ہو جاتا ہے۔ لوگ ضروریاتِ زندگی سے تنگ آ کر یا مرنے لگتے

ہیں۔ یا بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

پس ہمیں لازم ہے کہ ہمیشہ قرض سے بچتے رہیں اور اپنی آمدنی و خرچ کا تخمینہ بنا لیا کریں۔ عموماً خرچ میں خوراک۔ لباس۔ مرمّتِ مکان۔ تعلیم۔ مہمان نوازی اور کاروباری ترقی کی مدّات قائم کریں۔ ہر مدّ کا خرچ آمدنی کے اندازہ سے مقرر کریں۔ اور بچت کی مدّ بھی قائم کریں اور ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچاتے رہیں۔ ایسا کرنے سے ہمارے اخراجات ایک مقررہ حد سے نہیں بڑھیں گے اور فضول خرچی سے بچے رہیں گے۔ درحقیقت فضول خرچی ہی تباہی کا سبب ہوتی ہے ؎

فضول خرچ ہزاروں تباہ حال ملے — نشانہ وہدف ناوکِ زوال ملے

اس طرح کفایت شعاری کی عادت پیدا ہو جائے گی۔ تو خوشحالی رہے گی۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کبھی مہینے مرمت مکان کی ضرورت نہ ہو یا مہمان نہ آئیں اور ان مدّات کا خرچ بچ رہے۔ پھر جب ایک ہی دفعہ ان مدّات میں زیادہ خرچ کرنا پڑے تو وہی رقم کام آئے۔ اور پریشانی نہ ہو

فی زمانا کفایت شعاری کی انجمنیں قائم کرنے کا رواج قرض سے بچنے کا بہترین علاج ہے۔ ایسی انجمنوں کا ممبر بننا چاہیئے۔ کیونکہ اشد ضرورتوں کے وقت ان انجمنوں سے قرض حسنہ بھی مل جاتا ہے۔ اور اگر کاروباری حالت اس قسم کی ہو جس میں قرضہ لینا ہی پڑتا ہو تو پھر امدادِ باہمی کے اصولوں پر قرضہ کی انجمن کی بنیاد ڈالنی چاہیئے۔ ایسی انجمنوں کی طرح ڈالنے کے قواعد و ضوابط رجسٹرار صاحب بہادر کواپریٹو سوسائٹیز سے ملتے ہیں۔ اور وہی صاحب ایسی انجمنوں کے بنانے کی منظوری دیتے ہیں۔ ان انجمنوں کے حصہ دار کو کچھ پس انداز کرنے کے لئے بھی مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اور ضرورت ہو تو اس کی حیثیت کے مطابق ایک مقررہ حد کے اندر اسے قرضہ بھی دیا جاتا ہے۔ جس کی شرح سود بہت ہی کم ہوتی ہے۔

ایسی انجمنیں جہاں جہاں ترقی کر گئی ہیں۔ اُن کا اپنا سرمایہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب حکومت سے قرض لینے کی انہیں ضرورت ہی نہیں رہی۔ اور ممبرانِ انجمن حسب ضرورت قرضِ حسنہ حاصل کر لیتے ہیں۔

روزانہ ضروریات کے لئے بھی بعض لوگ دوکانداروں سے اُدھار لے آتے ہیں اور مہینہ کے اخیر پر حساب کر کے رقم ادا کر دیتے ہیں۔ یہ طریق بھی اچھا نہیں۔ اس طرح بعض اوقات اپنی پسند کی چیز نہیں ملتی۔ اور دوسری چیز خریدنی پڑتی ہے۔ اور پھر وہ مہنگی بھی ملتی ہے۔ کیونکہ مقررہ دوکاندار کو چھوڑ کر دوسرے سے اُدھار نہیں لیا جا سکتا۔

پس روزمرہ کی ضروریات کو بھی نقد دام ادا کر کے خریدنا چاہئے اور متفرق اشیاء کو بطور قرض خریدنے سے بچنا چاہیئے۔

۷۔ قومی ترقی

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں جن قوموں نے ترقی کی ہمیشہ کسی لیڈر یا بانیٔ مذہب کی پیروی سے کی ہے۔ اور جب انہوں نے اپنے رہنماؤں کی ہدایات سے مُنہ موڑا۔ ذلیل ہو کر زوال پذیر ہو گئیں۔ گویا قومی ترقی کے لئے کسی لیڈر کا ہونا ضروری ہے۔ خواہ وہ منجانب اللہ ہو جسے پیغمبر کہتے ہیں اور خواہ لوگوں نے اُسے خود منتخب کر لیا ہو۔ جیسا کہ آجکل جمہوری سلطنتوں میں ڈکٹیٹر یا صدر منتخب ہوتے ہیں۔

اس راہنما کی ہدایات مذہب کا حکم رکھتی ہیں اور ان کی پیروی قوم کے لئے فرض ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ ؎

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں

اور قرآن مجید کی آیت اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ میں حاکمِ وقت کی پیروی کا حکم اسی قومی تعمیر کی دلیل ہے اور مراد یہ ہے کہ حاکمِ وقت کی اطاعت بھی اسی طرح ضروری ہے۔ جس طرح اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ قومیں ہمیشہ رہبروں کے بنانے سے بنتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض قومیں پیدا ہوتے ہی مٹ گئیں اور بعض کچھ عرصہ زندہ رہیں اور کچھ ایسی ہیں جو ہزارہا سالوں سے اب تک قائم ہیں۔ اس لئے ان اسباب کو جاننا چاہیئے۔ جن سے قومی ترقی وابستہ ہے۔

قوم افراد کا مجموعہ ہوتا ہے۔ پس جب تک افراد میں ترقی کی صلاحیت نہ ہو کوئی قوم نہ بن سکتی ہے اور نہ ترقی کر سکتی ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ صلاحیت کیا ہے:۔

ا۔ علم و فن کی ترقی۔ جب تک کسی قوم کے افراد علم و فن سے بے بہرہ ہوں گے۔ تہذیب اخلاق اور تمدن قومی کے اصولوں سے واقف نہیں ہو سکتے۔ علم سے ہی وہ خوبیاں اور اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو نفوس کو نیک و بد سے آگاہ کرتے ہیں۔ اور علم سے ہی انسان اپنے اور دوسروں کے لئے مفید بن سکتا ہے۔ جب علم کا نور پھیلتا ہے۔ تو انسان جہالت کی تاریکیوں سے نکل کر اندھا دھند تقلید اور بے راہ روی سے بچتا ہے۔ اس سے سامنے ذاتی اور قومی مفاد کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ اور وہ امن و آسائش

سے زندگی بسر کرنے کی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ وہ فنون میں قابلیت بہم پہنچاتا ہے۔ اور اپنی ذات و ملت کے لئے ایسی ایجادات کرتا ہے جو واقعی اُسے حیوانوں اور جاہل انسانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں خلافتِ الٰہی کا مستحق ہوتا ہے۔ اور زمین پر اپنی حکومت قائم کرتا ہے۔ پس کسی قوم کے بننے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ کہ اس کے افراد علوم و فنون میں ترقی کریں۔ تاکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کامیاب بنا سکیں۔ اور آزادانہ طور پر دنیا میں رہ سکیں۔

قدیم زمانہ میں ہندوستان، مصر اور یونان والوں کو جو عروج حاصل تھا یا آج جو رفعت یورپین اقوام کو حاصل ہے وہ علوم و فنون کی ترقی سے تھا اور ہے۔

۲۔ ملکی صنعتوں اور پیداوار کا فروغ۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص مختلف علوم و فنون میں کامل ہو اور وہ دُنیا والوں سے الگ تھلگ بیٹھ کر زندگی گزارے اس حالت میں اس کے کمالات نہ اس کی ذات کے لئے مفید ہوں گے اور نہ دُوسروں کے لئے۔ پس قوم کے افراد علوم و فنون سے واقف ہو کر جب تک میدانِ عمل میں نہ آئیں گے اپنی حالت کو بہتر نہیں بنا سکتے انہیں لازم ہے کہ زمین کا جائزہ لیں۔ آب و ہوا کے لحاظ سے جو اجناس وہاں پیدا ہو سکیں بکثرت سے پیدا کریں۔ اور اپنی پیداوار اپنی ضرورت کے مطابق ذخیرہ کر کے باقی کو فروخت کریں اور جو غیر ملکی پیداوار ضروری ہو۔ حاصل کریں مختلف کلیں لگائیں اور کپڑا اور دُوسرا سامانِ زندگی اپنے لئے تیار کریں۔ کیوں کہ غیر ملکی سامان ہمیشہ مہنگا پڑتا ہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں کو چھان ماریں اور معدنیات کے خزانے حاصل کریں۔ رات دن محنت سے کام کریں۔

اور یاد رکھیں کہ محنت سے عظمت حاصل ہوتی ہے۔ اور محنت کے بغیر اپنی صنعتوں اور پیداوار کو فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔

فی زمانہ جو قومیں بام ترقی پر پہنچی دکھائی دیتی ہیں۔ اُنہیں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان کی ترقی کا ایک راز یہ ہے۔ کہ وہ محنت سے کماتی اور کھاتی ہیں۔ وہ اپنی ضروریات خود پیدا کرتی ہیں۔ بلکہ اتنی پیداوار حاصل کرتی ہیں کہ دُنیا بھر کے لوگ ان سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ قومی ہمدردی۔ لوگ علم و فن میں دسترس رکھتے ہوں اور ملکی پیداوار اور ضروریات کو پورا کرنے کے لئے محنت بھی کرتے ہوں۔ مگر جب تک قوم کو سربلند دیکھنا ان کا نصب العین نہ ہو۔ قوم سرفراز نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے۔ کہ چند افراد اپنی محنت اور کوشش سے سرمایہ دار بن جائیں۔ لیکن جب تک وہ باقی افراد کو اپنے ساتھ اونچا لے جانے کی سعی نہ کریں گے اور اُن کے افلاس اور بیکاری کو دُور کرنے اور ان کی مشکلاتِ زندگی کو ختم کرنے کا درد ان سرمایہ داروں میں پیدا نہ ہوگا۔ قوم کی اکثریت زوال پذیر ہو کر ان بلند اقبال ہستیوں کو بھی پستی کی طرف لے جائے گی۔ مدرسوں۔ ہسپتالوں اور یتیم خانوں کے قیام قومی ہمدردی کی روشن مثالیں ہیں۔ سرمایہ دار ہستیاں اپنے اہل ملت کے لئے کچھ خرچ کرتے رہیں۔ ان کے رنج و راحت میں شریک ہوں اور اُن کے مصائب کو اپنی تکالیف خیال کریں تو بہت جلد وہ ایک بلند درجہ قوم بن سکتے ہیں۔ اسلام نے مسلمانوں کو اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کہہ کر ایک دُوسرے کی ہمدردی کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور زکوٰۃ کو فرض قرار دے کر پسماندہ لوگوں کی ترقی کی راہ نکالی ہے۔ اور الٰہی احکام پر عمل کر کے مسلمان مہذب۔ متمدن اور سرفراز قوم بن گئے ہیں۔ مغربی اقوام اس قومی ہمدردی

سے عروج پر پہنچ رہی ہیں۔ ایک انگریز کو اگر چین والے ناحق قتل کر دیں تو سلطنتِ برطانیہ سارے ملکِ چین کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اور یہی حال دُوسرے ممالک کا ہے۔ پس قوم ایک جسم ہے۔ اور افراد اس جسم کے اعضاء ہیں جس طرح ایک عضو کو تکلیف ہو تو سارا جسم دردمند ہوتا ہے۔ اسی طرح قوم کو اپنے افراد کے لئے ہمدرد ہونا ضروری ہے اور اس ہمدردی کے نظام کے بغیر قوم ترقی نہیں کر سکتی۔

۴۔ جوشِ جہاد۔ ایک مہذب اور متمدّن قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ان تمام دشمنوں کا مقابلہ کرے جو ان کی تہذیب اور مملکت کو نقصان پہنچائیں۔ ہر اس رکاوٹ کو دُور کرے جو اس کی ترقی کی راہ میں حائل ہو۔ اور دُنیا کو جابر، سرکش اور ظالم لوگوں کے پنجے سے نجات دے۔ کیونکہ ایسا کرنا اخلاقی فضائل کی دلیل ہے۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ایمان کا سب سے بلند درجہ یہ ہے کہ جہاں کہیں بدی کرنے والا نظر آئے اُسے اپنے ہاتھ سے روکو اور اگر ہاتھ سے روکنے کی ہمّت نہیں تو زبان سے سمجھاؤ کہ وہ بدی سے باز آئے یہ ایمان کا دُوسرا درجہ ہے۔ اور سب سے کم درجہ ایمان کا یہ ہے کہ اُسے دل میں بُرا کہو۔ پس بدی اور ظلم کی طاقتوں کو مٹانا اور دُنیا میں امن قائم رکھنا ہر مہذب قوم کا فرض ہے۔ جو لوگ کسی جاندار کو مارنا گناہ سمجھتے ہیں وہ جنگلی درندوں کے حملوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جو قوم اپنی حفاظت اور دشمن کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہوتی وہ دُنیا سے مٹ جاتی ہے۔ انسان کو خدا کا خلیفہ کہتے ہیں اور خلافتِ الٰہیہ کا منشاء شر اور ظلم کا استیصال ہے۔ پس قوم کے افراد میں مرنے مارنے کا جذبہ پیدا کرنا ضروری ہے۔

تاریخ کہ رہی ہے کہ جس قوم میں جوشِ جہاد پیدا ہوا۔ وہی دنیا پر چھا گئی۔ بزدل ہمیشہ مغلوب ہوئے اور غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے۔ جب کسی قوم سے جوشِ جہاد مٹ جاتا ہے۔ وہ فوراً زوال پذیر ہو جاتی ہے۔

علامہ اقبال یہی راز کی بات کہ گئے ہیں ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

۵۔ قانون کا احترام۔ قوم کے افراد آپس میں ہمدرد بھی ہوں۔ ان میں جوشِ جہاد بھی ہو۔ لیکن جب تک وہ کسی رہبر یا لیڈر کے احکام کے ماتحت ایک نظام قائم نہ کریں اور منظم نہ ہوں۔ خود رائی سے تباہ و برباد ہو جائیں گے فوج کے سپاہی اگر اپنی اپنی رائے سے دشمن کا مقابلہ کرنا چاہیں۔ تو بہت جلد ان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اسی لئے انہیں چاہیئے کہ سپہ سالار کے منشاء کے مطابق آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں۔

مذہبی راہنما (پیغمبر) تو خدا کی طرف سے مبعوث ہوتے ہیں۔ ان کی رائے میں تو غلطی کا امکان نہیں ہو سکتا۔ البتہ قومی رہبر جو افرادِ قوم کی طرف سے منتخب ہوتے ہیں ان کی غلط رائے کبھی قوم کی تباہی کا باعث بنتی ہے۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ پس قوم کا فرض ہے کہ لیڈر کے انتخاب میں نہایت احتیاط سے کام لے۔ اور اگر کسی یزید صفت شخص کو لیڈری کا امیدوار دیکھے تو امام حسینؑ کی طرح جان پر کھیل جائے اور اس کی اطاعت سے انکار کر دے اس طرح باقی قوم کی مردہ زندگی میں پھر جان پڑ سکتی ہے۔ لیکن جب غور و فکر کے بعد کسی شخص کو اپنا رہبر مان لے تو اس کے احکام کی اطاعت کرے۔ قانون کا احترام قوم کی جان ہے۔ جس ملک کے باشندے آئے دن قانون کی خلاف

ورزی کرتے رہے ہیں۔ وہ مُلک کبھی خوشحال نہیں رہ سکتا۔ باغی اور سرکش لوگ قوم کے دشمن ہوتے ہیں۔ وہ فتنہ پسند مٹ جائیں تو اچھا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ اگر کوئی لیڈر ہمیشہ اپنی رائے کو صحیح سمجھے اور قوم کے احساسات اور جذبات کا احترام نہ کرے وہ مشاورتی کمیٹی نہ بنائے یا مشاورتی کمیٹی کی رائے کی قدر نہ کرے تو متفقہ طور پر اس کو صدارت کی گدی سے علیحدہ کیا جائے۔ لیکن یہ کام بھی ایک قاعدے اور قانون کے ماتحت ہو۔ بدامنی کی زندگی ذلیل ہوتی ہے۔ اور دشمنوں کو غلبہ حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ پس قیامِ امن کے لئے قانون کا احترام ضروری ہے اور یہی ایک چیز قومی ترقی کی جان ہے÷

۸۔ صداقتِ اسلام

دُنیا میں جس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی صداقت کا دعوےٰ کرتا ہے۔ اور دُوسرے مذہب کو باطل قرار دیتا ہے اور حق و باطل کا یہ جھگڑا ہمیشہ معبُود کے تعیّن۔ تزکیۂ نفس کے قواعد اور تمدّن کے اصُولوں کے متعلق ہوتا ہے۔ اِس لئے ہم انہی باتوں کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔

معبُود کا تعیّن۔ خدا کا وجود تسلیم کرنے کے لحاظ سے لوگوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ ہیں جو خدا کی ہستی کے قائل ہیں اور دُوسرے وہ ہیں جو اس کا انکار کرتے ہیں اور اُن کا عقیدہ ہے کہ دُنیا خود بخود مادے سے بنی۔ اور بعض منکرین یہ بھی کہتے ہیں کہ دُنیا کی پیدائش کسی ایک وقت نہیں ہوئی بلکہ کائنات کا یہ سلسلہ اسی طرح چلا آتا ہے۔ اور اسی طرح چلا جائے گا۔ اب یہ دیکھنا

ہے کہ دونوں میں سے کون سچا ہے۔

طبقات الارض کے ماہرین نے تحقیقاتِ جدید میں ٹھوس دلیلیں دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں۔ آج سے ہزار ہا سال پہلے اس کا نشان نہ تھا۔ اور پانی ہی پانی تھا۔ پھر اس سے زمین نکلی۔ پہاڑ اور جنگل پیدا ہوئے اور انسان کا وجود ظہور میں آیا۔ اور اسی طرح وہ لکھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش میں روشن غبار کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس روشن غبار (سدیم) میں حرکت پیدا ہوئی اور مختلف ستارے اور سیارے وجود میں آئے اور اسی سلسلہ میں بے جان مادے نے جاندار شکل اختیار کی اور وہ جاندار مادہ ترقی کے بہت سے مراحل طے کر کے انسان بنا۔

اب ان محققین سے یہ پوچھئے کہ پانی سے زمین کس طرح نکلی۔ اس سے پہلے کیوں نہ نکلی تھی یا سدیم میں جو حرکت پیدا ہوئی وہ خود بخود کیوں اور کس طرح پیدا ہوئی اس سے پہلے کیوں نہ ہوئی تھی تو ان سوالوں کے جواب میں ایک خارجی طاقت کا وجود ماننا پڑتا ہے۔ جس نے اس مادے میں حرکت پیدا کی۔ اور اسی طاقت کو خدا کہتے ہیں۔ نیز تجربات شاہد ہیں کہ مادہ سے کسی شئے کا وجود اس وقت تک نہیں بنتا جب تک کوئی بنانے والا نہ ہو۔ ایتھر اور نمک سے برف بنتی ہے۔ لیکن دونوں کو الگ الگ پڑا رہنے دیں وہ خود بخود مل کر برف نہیں بن سکتے۔ پس ثابت ہوا کہ دنیا خود بخود نہیں بنی بلکہ اس کے بنانے والا خدا ہے۔

اب یہ بات بھی کہ خدا کے ساتھ مادہ بھی ازلی اور ابدی ہے، غلط ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ جو طاقت مادے میں حرکت پیدا کرتی ہے وہ گویا مادے کی متصرف ہے۔ اور متصرف کسی شئے کو فنا کر سکتا ہے۔ جو فنا کر سکتا ہے۔

وہ اس کے بنانے پر بھی قادر ہو سکتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ خدا کی قدرت ہی ازلی اور ابدی ہے۔ باقی اشیاء اسی نے اپنی قدرت سے پیدا کیں۔ یہی دعویٰ اسلام کا ہے۔

اب ذرا اس گروہ کو دیکھئے جو خدا کو مانتا ہے۔ اس میں بھی مختلف عقائد کے لوگ ہیں۔ بعض تین خدا مانتے ہیں کہ ایک پیدا کرنے والا ہے۔ دوسرا پالنے والا اور تیسرا مارنے والا۔ بعض لوگ خدا کے سوا دیگر اشیاء کو بھی حاجت روا مانتے ہیں اور آگ۔ پانی۔ مٹی۔ ہوا اور دیگر مادوں کو بھی معبود تسلیم کرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو خدا کو صاحب اولاد مانتے ہیں۔ لیکن ان سب کے عقائد غلط ہیں۔ کیونکہ جب خدا کو محرک بالذات تسلیم کر لیا جائے تو اس میں ان تمام صفات کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ جن سے مادی اشیاء کا انقلاب وابستہ ہے۔ اور جب آفرینشِ عالم کی بحث میں صرف ایک ہی طاقت کو فعالِ حقیقی اور قادرِ مطلق تسلیم کیا گیا ہے۔ تو اس کے ساتھ اور طاقتوں کا وجود تسلیم کرنا قطعاً غلط ہو جاتا ہے اور اور تولید و تناسل کا سلسلہ مادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے خدا کی ذات کو اس سے پاک اور علیحدہ ماننا پڑے گا۔ اور یہی عقیدہ اسلام نے خدا کے متعلق پیش کیا ہے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ۔ لَمْ يَلِدْ۔ وَ لَمْ يُوْلَدْ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔

تزکیۂ نفس۔ انسان کی روحانیت پر دو چیزیں اثر انداز ہوتی ہیں۔ ایک اعمال اور دوسری خوراک۔ اعمال میں رواداری۔ راستبازی۔ دیانت اور عدالت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان سے روحانیت بلند سے بلند تر ہو جاتی ہے۔ لیکن ان سے بڑھ کر خالق کی معرفت ہے۔ کائنات کے نظام کا مشاہدہ کر کے اور پھر اپنے وجود کی بناوٹ پر غور و فکر کر کے جو شخص خلاقِ برحق پر ایمان

نہیں لاتا۔ اس کا نفس بے راہ رَو ہے۔ اسے اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہوتا۔ اور زندگی کی راہیں اس کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ پس خالق کی شکر گزاری تزکیۂ نفس کے لئے پہلی چیز تصوّر کرنی چاہیئے۔ اور اس شکر گزاری کے طریقے جو عوام میں رائج ہیں۔ ان تمام میں اسلامی عبادت ممتاز نظر آتی ہے۔ نماز اور روزہ سے بڑھ کر تزکیۂ نفس کے لئے کوئی شے مؤثر نہیں۔

اور پھر نماز کے اوقات دیکھیں۔ صبح نیند سے بیدار ہوتے ہیں گویا ایک موت کی حالت سے زندہ ہوتے ہیں۔ اس زندگی کے لئے خالق کا شکر بجالانا ضروری ہے۔ (نمازِ فجر) پھر دوپہر کے کھانے کے بعد ذرا آرام کر کے اس کھانے پینے کا شکریہ (نمازِ ظہر) پھر کاروبار کی بھرمار کے وقت خالق کی یاد (نمازِ عصر) دن بھر کے کام سے فراغت پانے کا شکریہ (نمازِ مغرب) رات کے کھانے کا شکریہ (نمازِ عشا) خالق کو اس کثرت سے یاد کرنا اور کوئی مذہب نہیں سکھاتا اور پھر روزہ سے جو تزکیۂ نفس حاصل ہوتا ہے۔ اس کی کیفیت روزہ داروں کو ہی معلوم ہوسکتی ہے۔ اسی طرح دیگر اعمال کا جائزہ لیں۔ مخلوقِ خدا سے رواداری یا حسنِ سلوک کی جو تعلیم اسلام نے دی ہے۔ اس کو مختصر طور پر بیان کرنے کے لئے بھی ایک دفتر چاہیئے۔ اسی حسنِ سلوک سے خدا کی خوشنودی اور اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ راستبازی۔ عدالت اور دیانت کے لئے جو احکام اسلام نے دیئے ہیں۔ ان کی پابندی سے نفس کو وہ کمال حاصل ہوتا ہے۔ جو فرشتوں کو بھی نصیب نہیں۔ اور اسلام کی تعلیم کے مقابلے میں کسی دوسرے مذہب کی تعلیم طہارتِ نفس کی ایسی کفیل نہیں ہے۔

یہی حال خوراک کا ہے۔ اسلام نے جن چیزوں کا کھانا جائز قرار دیا۔ وہ

ڈاکٹری لحاظ سے واقعی مفید ہیں اور جن چیزوں کو حرام کر دیا وہ واقعی صحتِ انسانی کے لئے مضر ہیں۔ تحقیقاتِ جدید میں بال کی کھال اتارتے ہیں۔ لیکن گہری تدقیق کے باوجود کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکا کہ مذہب اسلام نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ وہ جسمِ انسانی کے لئے نفع بخش ہیں۔ شراب اور سؤر کو دیکھئے مغربی ممالک کے لوگ ان کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ مگر ان کے ڈاکٹر ہمیشہ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ دونوں چیزیں مضرِ صحت ہیں۔

خلاصہ یہ کہ خوراک جزوِ بدن منبع ہے۔ اور اس سے خون اور دوسری اخلاط پیدا ہوتی ہیں۔ جو دل و دماغ پر اپنا اثر جاری رکھتی ہیں۔ اگر خوراک نجس ہوگی تو انسان کا گوشت اور پوست بھی نجس اثرات حاصل کرے گا اور اخلاق فاضلہ پیدا نہیں ہوں گے اور روحانی ترقی نقصان پذیر ہوگی۔ اسلام نے اعمال اور خوراک کے متعلق جو کچھ بتایا ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ روحانیت کے بلند ترین درجہ پر پہنچنے والی ہستیاں جس قدر زیادہ تعداد میں اسلام نے پیدا کی ہیں۔ ان کا عشرِ عشیر بھی دوسرے مذاہب میں نہیں ملتا۔

تمدن کے اصول۔ چوری۔ فریب اور جبر سے کسی شخص کی جائداد پر قبضہ کر لینا۔ نفع خوری کے بہانے سے کسی کا مال کھانا۔ کسی کی امانت یا قرضِ حسنہ کو واپس نہ دینا اور ناحق و ناروا لوگوں کو قتل کرنا وغیرہ عام برائیاں ہیں جو تہذیب و تمدن کے حق میں زہر ہلاہل کا حکم رکھتی ہیں۔ اور تقریباً تمام مذاہب ان برائیوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن جائداد سے لڑکوں کو حصہ دینا اور لڑکیوں کو محروم رکھنا کسبِ معاش کے لئے ہاتھ پاؤں نہ ہلانا۔ زناکاری اور بزدلی وغیرہ ایسے امور جو تہذیب و تمدن کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ اور جو فی الحقیقت فتنہ و فساد کا باعث بنتے ہیں۔ اسلام

کے سوا کسی مذہب نے ان کی اصلاح کی راہ نہیں دکھائی۔ اور مذہب اسلام نے لڑکی کو ورثہ دلا کر ثابت کیا ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کی بھی تمدن کے لئے ضرورت ہے۔ اور پھر هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ کہ کر بتا دیا ہے کہ عورتوں کے بغیر تم کسی عزت۔ وقار اور تہذیب کے حقدار نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کہ لباس کے بغیر آدمی غیر مہذب ہوتا ہے۔ اور اسی طرح دیگر احکام سے عورت کا جو درجہ اسلام نے بلند کیا ہے۔ اس کی مثال کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً کی دعا سکھا کر لوگوں کو اپنی دنیا بہتر بنانے کی راہ دکھائی ہے۔ اور لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کے ارشاد سے بتا دیا ہے کہ محنت اور کوشش کے بغیر تم دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ گویا بیکاری سے نفرت دلائی ہے۔ اسی طرح ازدواجی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے زناکاری سے روکا ہے۔ عورتوں کو پردے میں رہنے کی ہدایت کی اور مغربی ممالک کی عورتوں کی طرح معاشقہ کرنے اور عریانی کی اجازت نہیں دی۔ یہ کتنی بے غیرتی ہے کہ ایک عورت اپنے خاوند کے سامنے کسی دوسرے شخص سے بغلگیر ہو اور پھر میاں بیوی اس کو آزادی کی زندگی خیال کریں۔ اسلام نے واضح کیا ہے کہ جو عورت نکاح میں آ گئے۔ وہ تمہاری بیوی ہے۔ اس کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ دوسری عورتوں سے معاشقہ کرنا فتنہ و فساد پیدا کرتا ہے۔ جس سے خونریزی کی وارداتیں ہوتی ہیں۔

اسی طرح دوسرے مذاہب کے لوگوں سے میل جول رکھنے کے قواعد اور معاملات کے اصول جو اسلام نے بتائے ہیں۔ وہ کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتے۔ اسلام نے خطاکار کی خطا معاف کرنا مستحسن قرار دیا ہے۔

لیکن یہ نہیں کہا کہ اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ لگائے تو دوسرا گال اُس کے آگے کر دو۔ بلکہ ظالم سے ظلم کا بدلہ لینے کے لئے اَلْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ کا حکم دیا ہے۔ اور واضح کیا ہے۔ کہ بزدلی سے تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ حق کی اشاعت تمہارے لئے ضروری ہے جَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہ پر کاربند رہو۔ اور ظالموں کو مٹانے کے لئے اتنا لڑو کہ دُنیا میں امن قائم ہو جائے۔ آزادی سے زندگی بسر کرنا تمہارا پیدائشی حق ہے۔ اس آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی حفاظت اور دشمن کی مدافعت کے سامان پیدا کرو۔

غرض اسلام نے تمدن کی راہیں بالکل صاف کر دی ہیں اور دیگر مذاہب کے راستوں میں جو گڑھے اور غار دکھائی دیتے ہیں۔ اسلام میں ان کا نشان نہیں ملتا۔ گویا مذہب اسلام ان فطری اصولوں پر مبنی ہے۔ جن پر کاربند ہو کر انسان معرفتِ الٰہی حاصل کرتا ہے۔ اور دنیا و آخرت میں بھی سُرخروئی پاتا ہے۔

۹۔ دولت و افلاس

کراچی میل لاہور کے اسٹیشن سے چل پڑی۔ ڈبے میں جو ہڑبونگ مچا ہُوا تھا۔ ختم ہو گیا اور ایک سناٹا سا چھا گیا۔ ہر مسافر اپنی جگہ پر خاموش بیٹھا تھا۔ آخر میرے قریب بیٹھے ہُوئے دو شریف آدمیوں نے اس مُہرِ سکوت کو توڑا اور مصروفِ گفتگو ہُوئے۔ چونکہ اُن کی باتیں مفید تھیں۔ اس لئے لکھ دیتا ہوں:۔

پہلا شخص بولا۔ دُنیا میں غریب آدمی کس کام کا ہے۔ جہاں کہیں چار آدمی مل کر بیٹھے ہوں۔ اُن میں اوّل تو کسی غریب کو بلایا ہی نہیں جاتا۔ اور اگر وہ

کسی طرح مجلس میں آجائے تو متمول طبقہ کے لوگ اُسے اپنے پاس بٹھانا پسند نہیں کرتے۔ غریب کو حقیر جانتے ہیں۔ اس کی بات نہیں سنتے۔ اگر وہ کوئی مفید رائے بھی پیش کرے تو اُسے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ حکومت کے انتظام کے لئے ہمیشہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ اور غریب طبقے کے لوگوں کو کوئی نمائندگی حاصل نہیں ہوتی۔ خدا نے شاید غریب کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ جنگلوں سے ایندھن کاٹ کر لائے۔ کانوں میں رات دن جان کھپائے۔ کلیں چلانے اور بوجھ اٹھانے میں اپنی طاقت خرچ کرے چلچلاتی دھوپ اور کڑکڑاتے جاڑے میں ہل چلائے۔ لیکن پھر بھی اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کے لئے دُوسروں کا محتاج رہے۔ غریب دن بھر کام کرنے کے بعد جب اپنی مزدوری کے پیسوں کو دیکھتا ہے تو ایک آہ بھرتا ہے۔ اور اس کی جسمانی تکان کے ساتھ روحانی کوفت کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اطمینان سے اپنے خالق کی عبادت بھی نہیں کرسکتا بقول سعدی رحمۃ اللہ علیہ ؎

شب چو عقد نماز مے بندم　　　چہ خورد بامداد فرزندم

غریب اپنی اولاد کی صحیح تربیت نہیں کرسکتا اُس کے پاس اتنا روپیہ کہاں۔ جسے وہ بچوں کی تعلیم پر خرچ کرے یا جس سے اچھی خوراک کھلا کر اُن کی صحت کو برقرار رکھے وہ بیمار ہو جائے تو علاج نہیں کرا سکتا۔ اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتا ہے۔

غریب کو جب افلاس ستاتی ہے۔ تو وہ چوری کرنے یا جوا کھیلنے یا گداگری جیسی بدعادتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسے کسی سے ہمدردی نہیں رہتی۔ وہ دُنیا بھر کے متمول آدمیوں کو حسد کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور انہیں قتل کر

دینا چاہتا ہے۔ غریبوں کا یہی حسد اکثر ملکی بغاوتوں کا سبب بنتا ہے غریب نہ اپنے لئے کوئی مفید کام کر سکتا ہے اور نہ ہی دُوسروں کے لئے۔ اُس کے پاس سرمایہ ہی نہیں جس سے وہ رفاہِ عام کے کاموں میں حصّہ لے بخلاف اس کے امیر آدمی ہر جگہ عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اراکین سلطنت یہ امیر لوگ ہی تو ہیں کہ جس طرح چاہتے ہیں۔ حکومت کی گاڑی کو چلاتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو وہ روپیہ خرچ کرکے اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کمالات فنون کی سندیں انہیں ملتی ہیں اور سلطنت کے حصّہ دار بن جاتے ہیں۔ امیر آدمی فراغت سے بسر کرتا ہے وہ اور اُس کی بیوی بچے خوشحال رہتے ہیں۔ وہ خدا کی عبادت کرتا ہے تو اطمینانِ قلب سے کرتا ہے۔ مسجدیں۔ سرائیں اور یتیم خانے بنانا۔ کنوئیں کھدوانا اور اس قسم کے دُوسرے رفاہِ عام کے کام ہمیشہ امیروں کی دولت سے ہوتے ہیں۔ امیر لوگ ہی گویا جنت کے ٹھیکیدار ہیں کہ خدا کو بھی خوش کر لیتے ہیں اور مخلوقِ خدا کو بھی۔ ان کی دُنیا بھی اچھی اور آخرت بھی۔ اللہ تعالےٰ ان غریبوں پر رحم فرمائے۔ یہ کسی کام کے نہیں۔

جب پہلے شخص کی گفتگو ختم ہوئی تو دوسرے نے اس کے جواب میں یُوں کہنا شروع کیا:۔

آپ نے غریبوں اور امیروں کی حالت میں جو فرق بیان کیا ہے۔ اس کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن آپ نے دولت و افلاس کے ایک پہلو کو دیکھا ہے۔ اور دُوسرے پہلو پر نظر نہیں ڈالی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غریب کی زندگی تنگی ترشی سے گزرتی ہے۔ اور وہ افلاس سے تنگ آکر چوری چکاری بھی کرنے لگتا ہے۔ لیکن افلاس ایک ایسی شے ہے جو محنت کرنا سکھاتی

ہے۔ غریب صبر و قناعت کا پتلا ہوتا ہے۔ وہ اپنی حالت کا مقابلہ جب امیروں سے کرتا ہے۔ تو بسا اوقات رشک کی بدولت ایسی تجاویز سوچتا ہے۔ جن سے وہ اپنی حالت کو بہتر بنائے۔ علم دولت سے حاصل نہیں ہوتا۔ محنت سے حاصل ہوتا ہے۔ غریب محنت سے علوم و فنون میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ اور آخر کار بڑا بن جاتا ہے۔ دُنیا کے چوٹی کے علماء اور ماہرینِ فنون کے نام لو۔ ان میں بیشتر ایسے نکلیں گے جنھوں نے سُوکھے ٹکڑے چبا چبا کر اور صرف پانی پی پی کر زندگی گزاری۔ لیکن محنت سے مُنہ نہ موڑا۔ گویا افلاس ہی ترقی کرنا سکھاتی ہے۔ اللہ تعالےٰ کے احکام کی بجا آوری جس طرح غریب کرتا ہے۔ امیر نہیں کر سکتا۔ نماز اور روزہ کا ثواب عموماً غریبوں کے حصے میں آتا ہے۔ جوشِ جہاد سے سرشار ہو کر غریب جان دے دیتا ہے۔ اور امیر مُنہ دیکھتے رہ جاتے ہیں تواضع۔ انکساری۔ ہمدردی اور محبت جس قدر غریبوں میں پائی جاتی ہے۔ امیر اُس سے آشنا نہیں ہوتے۔ دولتمند دولت کے نشہ میں سرشار ہو کر خدا کو بھول جاتا ہے۔ مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے۔ عیاشی اور تن آسانی میں مبتلا ہو کر وہ ایسا سیاہ کار ہو جاتا ہے کہ اسے انسان کہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دولت انسان کو مغرور کرتی ہے۔ دولت سے حرص پیدا ہوتی ہے۔ دولتمند اپنی دولت کو اور بڑھانا چاہتا ہے۔ اور جبر و تعدی اور دغا فریب سے کام لینا اس کا شیوہ ہو جاتا ہے۔ وہ دُوسروں پر حملے کرتا ہے۔ لوگوں کے حقوق غصب کرتا ہے۔ تاکہ اپنی املاک کو بڑھائے۔ ؎

ہفت اقلیم ار بگیرد پادشاہ ہمچناں در بندِ اقلیمِ دِگر

خود رائی اور خود پسندی دولتمند کی طبیعت بن جاتی ہیں۔ جن سے وہ قارون کی طرح دولت سمیت زمین میں غرق ہو جاتا ہے یا فرعون کی طرح

دریا میں ڈوب کر زندگی کو ختم کرتا ہے۔ دیکھتے ہو۔ دُنیا میں آئے دن جو لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اور فتنہ و فساد اور قتل و غارت کی وارداتیں ہوتی ہیں۔ سب زر اور زمین کے حصُول کے لئے ہیں۔ غریب کمزور ہوتا ہے اور کمزوری انسان کو مجبُور کرتی ہے۔ کہ وہ گناہوں کا مرتکب نہ ہو۔ اور دَولت ایک زبردست طاقت ہے جو گناہوں پر آمادہ کرتی ہے۔

مَیں نے ان دونوں حضرات کی گفتگو سُن کر کہا۔ کہ آپ دونوں راستی پر ہیں۔ اور آپ کی باتوں سے جو نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ غریب آدمی اگر نیک چلن ہو اور محنت کرے تو امیر بن سکتا ہے۔ اور امیر آدمی اگر بدچلن اور فضول خرچ ہو جائے تو تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ نہ افلاس نیکی کے کاموں سے روکتی ہے۔ اور نہ دَولت بدکاری سکھاتی ہے۔ بلکہ نیک چلن یا بدچلن ہونا انسان کی تربیت اور صحبت پر منحصر ہے۔ غریبوں میں نیک بھی ہوتے ہیں اور بد بھی۔ اسی طرح دولت مند خدا کے فرمانبردار بھی ہوتے ہیں اور سرکش بھی۔ گویا دُنیا میں کوئی شے بُری نہیں۔ اس کا استعمال اُسے اچھا یا بُرا بنا دیتا ہے۔ مثلاً تلوار سے ظالم کا سر اڑا دیں تو تلوار اچھی ہے۔ اور اگر کسی کو ناحق قتل کریں تو تلوار بُری ہے۔

اتنے میں گاڑی رُکی۔ سٹیشن آگیا۔ اور ہم نے اُتر کر اپنی اپنی راہ لی +

۱۰- میں پڑھ کر کیا کروں گا

نوٹ:- اس مضمون میں تمام کاموں کا ذکر کرو- اور جو کام کرنا چاہو اُسے دُوسروں کے مقابلہ میں مفید ثابت کرو اور اس کا ذکر سب کے اخیر میں کرو- نمونہ کے طور پر یہاں صنعت و حرفت کو ترجیح دی گئی ہے اور اسے سب کے بعد درج کیا ہے-

دِل تو چاہتا ہے کہ امتحانِ میٹرک پاس کرنے کے بعد کسی کالج میں داخل ہو جاؤں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے پھر کوئی اچھا سا کام شروع کروں- کیونکہ اعلیٰ ملازمتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہے- اور ملازمت کرنا مقصود نہ ہو تو بھی اعلیٰ تعلیم سے انسان تہذیب و تمدّن کا کمال ارتقا حاصل کر سکتا ہے- لیکن میرے والدین غریب ہیں ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں جو خرچ کر کے مجھے اعلیٰ تعلیم دلا سکیں- اس لئے مجبور ہوں کہ میٹرک پاس کر کے کوئی پیشہ اختیار کروں- تاکہ حصُولِ معاش کی پریشانی نہ ہو-

کسی پیشہ کے انتخاب کے لئے داناؤں کے اس مقولہ پر نظر پڑتی ہے- جو انہوں نے کہا ہے- ؎

اُتم کھیتی مدھم بیوپار نکھد چاکری بھیک ندار

اور جی چاہتا ہے کہ کھیتی باڑی کا کام کروں- دس بیگھے زمین اپنی ملکیت ہے- اُس میں جدید طریقوں سے کاشتکاری کر کے میں اچھا نفع حاصل کر سکوں گا- اور والد صاحب کا ہاتھ بھی بٹ جائے گا- اس پیشہ میں آزادی بھی ہے- اور کمائی بھی زیادہ ہے- اگرچہ آفاتِ ارضی و سماوی سے کبھی کبھی فصلیں برباد ہو جاتی ہیں اور کاشتکار کو نقصانِ عظیم پہنچتا ہے لیکن

پھر بھی زراعت کی پیداوار ہی ہے۔ جس پر مخلوقِ خدا کا انحصار ہے۔ اس سے کافی دولت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور مخلوقِ خدا کو فیض بھی پہنچتا ہے۔ لیکن مدرسہ کی تعلیم نے میرا جسم کمزور کر دیا ہے۔ مجھ جیسے نرم و نازک شخص سے ہل چلانے اور کٹائی وغیرہ کرنے کا کام نہیں ہو سکے گا۔ کاشتکاری کے لئے زیادہ محنت درکار ہے۔ اور طاقتور جسم کی ضرورت ہے۔ اس لئے مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا پھر سوچتا ہوں کہ تجارت شروع کروں۔ تجارت ایک شریف پیشہ ہے جس میں انسان کو آزادی حاصل ہے۔ اپنا مال دوسرے علاقوں میں لے جانے اور وہاں سے مالِ تجارت خریدنے کے لئے سیاحت کرنی پڑتی ہے۔ اس سے تفریحِ طبع بھی ہوتی ہے۔ اور لوگوں سے میل ملاپ کا موقع بھی ملتا رہتا ہے پھر مختلف حالات و واقعات نظروں سے گزرتے ہیں۔ اور زندگی کا تجربہ وسیع ہوتا رہتا ہے۔ ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ مل کر زندگی گزارنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ اور منافع کی تو کوئی حد نہیں۔ بعض سودے اس قسم کے ہوتے ہیں جن میں ہزاروں روپے نفع حاصل ہوتا ہے۔ دنیا میں جتنے امیر لوگ ہیں سب تجارت سے ہی امیر کبیر بنے ہیں۔ لیکن اس کے لئے بھی سرمایہ کی ضرورت ہے۔ جو میرے پاس نہیں۔

سو دو سو روپے کی راس سے معمولی دوکانداری کرنا فائدہ مند نہ ہوگا۔ کیونکہ جتنا زیادہ سودا دوکان میں ہوگا اتنی ہی زیادہ بکری ہوگی چھابڑی لگانا یا سڑکوں اور گلیوں میں پھر کر سودا بیچنا ذلیل کام ہے۔ اس لئے اسے بھی چھوڑتا ہوں اور ارادہ کرتا ہوں کہ کہیں چھوٹی موٹی ملازمت اختیار کر لوں کیونکہ نوکری میں ایک مقررہ تنخواہ ہر مہینے مل جاتی ہے۔ اور زراعت کی طرح سخت مشقت اور تجارت کی طرح دشت نوردی بھی نہیں کرنی پڑتی۔

ملازم اپنے دفتر کے اوقات میں مقررہ کام کر کے باقی وقت آسائش سے گزار لیتا ہے۔ اور دوسرے کاموں کی طرح نقصان کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ نفع ہی نفع ہوتا ہے۔ ملازم کو اُجلے لباس میں دیکھ کر لوگ عزت کرتے ہیں۔ مگر دیکھتا ہوں کہ ملازمت کتنی بڑے درجے کی کیوں نہ ہو۔ اس میں غلامی کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ ہر وقت آقا یا حاکمِ اعلیٰ کا ڈر لگا رہتا ہے۔ کہ کہیں کسی کام سے ناراض نہ ہو جائے۔ آئے دن کے احکام سے ملازم کا قافیہ تنگ رہتا ہے۔ بعض دفعہ کام اتنا بڑھ جاتا ہے کہ راتوں کو بھی جاگ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ اور کام کے مقابلہ میں تنخواہ کم ملتی ہے۔ یا زیادہ کمانے کی حرص پیدا ہوتی ہے۔ تو رشوت اور بد دیانتی کی عادت پڑ جاتی ہے اور ملازم بے ایمان ہو کر بدنام ہو جاتا ہے۔ اور پھر کبھی انہی بد عادات کے باعث وہ ملازمت سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔

غرضیکہ ملازمت کی ذلت بہت بری ہے۔ اور ملازمت کی غلامی ایسی لعنت ہے کہ ؎

پڑے پتھر پہ تو پتھر کی گرانی نہ رہے　　گزرے دریا پہ تو دریا کی روانی نہ رہے

اس لئے ملازمت کا خیال ترک کرتا ہوں اور ارادہ کرتا ہوں کہ کوئی دستکاری سیکھ لوں۔ اور روزی کمانے کے قابل بن جاؤں۔ اس میں کسی بڑے سرمائے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑا عرصہ کسی کارخانہ میں کام کر کے یا کسی ماہر فن کی شاگردی اختیار کر کے کوئی صنعت سیکھی جا سکتی ہے۔ پھر آزادی سے کام کر کے روزی کما سکتے ہیں۔ ہمارا ملک صنعت و حرفت کے لحاظ سے دیگر ممالک سے بہت پیچھے ہے۔ اس لئے اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ ملکی صنعتوں کو فروغ دیا جائے اور جن صنعتوں کی کمی ہے۔ ان میں دستگاہ حاصل کی جائے۔ نہانے اور کپڑے

دھونے کے صابون تیار کرنا۔ جرابیں اور بنیانیں بُننا۔ آئینہ سازی۔ کٹلری کا سامان۔ اور اسی قسم کی بہتیری چیزیں ہیں۔ جن کے بغیر لوگوں کا گزارہ نہیں۔ پس مَیں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ ان صنعتوں میں سے ایک دو کا فن سیکھ لوں اور پھر یہ چیزیں تیار کر کے فروخت کر دیا کروں۔ یہ کام چند روپوں سے چل سکے گا۔ اور اس میں کسی نقصان کا احتمال بھی نہیں۔ بلکہ نفع ہی نفع ہے۔ اور آزادی بھی ہے۔

مَیں کوشش کروں گا کہ اُن کتابوں کا مطالعہ کروں جن میں غیر ملکی صنعتوں کا مفصّل بیان ہو۔ اور اس طرح غیر ملکی اشیاء جیسی اشیاء اپنے ملک میں تیار کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر ایمانداری اور محنت سے کسی صنعت کو فروغ دیا جائے تو ایک دُکان ایک کارخانہ کی صُورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور آدمی مالا مال ہو جاتا ہے +

۱۱۔ اخبار

اخبار چند اوراق کا مجموعہ ہے۔ جس پر مختلف خبریں چھپ کر شائع ہوتی ہیں۔ اشاعت کے لحاظ سے بعض اخبار روزانہ ہوتے ہیں۔ بعض سہ روزہ۔ کئی ہفتہ وار ہوتے ہیں اور کئی ماہوار۔ اور مضامین کے لحاظ سے بعض اخبار خالص مذہبی ہوتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر اخبار سیاسیات ملکی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اخبار کسی نوع کا ہو۔ اُس سے کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

علمی فوائد۔ اخبار قوم کے ادب (زبان دانی) کا بہترین خادم ہوتا ہے۔ زبان کے روزمرّہ اور محاورات اور اسلوب بیان کے نمونے اخبار کے ذریعے ہماری آنکھوں کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ اور اخبار کا مطالعہ زبان کی صحت و صفائی کا ملکہ پیدا کرتا ہے۔ ادیبوں کی صحبت میں رہ کر یا علمِ ادب کی کتابوں

کے مطالعہ سے کسی زبان کے سیکھنے میں بہت زیادہ وقت لگتا ہے اور پھر بھی مہارتِ تامہ حاصل نہیں ہوتی۔ مگر اخبار کے مطالعہ سے بہت جلد کسی زبان پر عبور حاصل کر سکتے ہیں۔ غیر ملکی اصطلاحوں کے ترجمے اور جدید اصطلاحیں آئے دن اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں۔ اور بہت جلد ہمارے علم میں آجاتی ہیں۔ کبھی زبان کے اصول و قواعد اور محاورات کی صحت و صفائی کے متعلق بحثیں ہوتی ہیں۔ اور اخبارات ساری قوم کو اُن سے آگاہ کرتے ہیں۔ جغرافیائی حالات۔ تاریخی تذکرے، سائنس کی ایجادات اور اُن کے فوائد۔ طبی معلومات اور اس قسم کی بے شمار معلومات اخبارات کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ غرض علمی خزانے جو ہمیں دیگر کتب کے مطالعہ سے بدیر اور بدقت معلوم ہوتے ہیں۔ اخبارات کے ذریعے بہت جلد معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور اخبار علمی ترقی کا بہترین ذریعہ ہے۔

اخلاقی فوائد۔ علم کے علاوہ اخلاق کو بہتر بنانے کے لئے بھی اخبار مفید ہے۔ مختلف جرائم کے مجرموں کے حالات اور اُن کی سزاؤں کا ذکر ہر روز پڑھنے میں آتا ہے۔ جس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ بزرگانِ دین اور رہبرانِ قوم کے زرّین اقوال عموماً اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں جس سے ہر طبع سلیم کو کافی ہدایت حاصل ہوتی ہے۔ قحط زدہ علاقہ کے حالات پڑھ کر یا سیلاب اور وباؤں کے مارے ہوئے لوگوں کی مصیبتوں سے آگاہ ہو کر ہر اہلِ وطن اُن کی ہمدردی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ گویا اخبار کی شمع بزمِ محبت و اخلاق کو روشن کرتی رہتی ہے۔

مالی فوائد۔ اخبار کی اشاعت اگر زیادہ ہو جائے تو بجائے خود ایک نفع بخش تجارت ہے۔ چنانچہ مشہور اخبارات کے مالک ہر جگہ امیر کبیر

دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن دیگر اشخاص جو اپنی اپنی تجارت کو فروغ دینا چاہیں۔ اخبارات میں اپنی دکانوں کے اشتہار شائع کرا دیتے ہیں۔ اور عوام تک اُن کی اشیاء کی شہرت پہنچ جاتی ہے۔ گاہک پیدا ہو جاتے ہیں اور گھر بیٹھے اُن کا مال فروخت ہو جاتا ہے۔ یورپ میں تو بعض اخبار صرف اشتہاروں کے لئے ہی چھپتے ہیں۔ اور تاجر لوگ اُن کے ذریعے نزدیک و دُور کے تجارتی حالات سے واقف ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں روزانہ اخبارات کے اندر مختلف منڈیوں کی اشیاء کے نرخنامے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جن سے تجارت میں آسانی ہوتی ہے۔ بعض دفعہ کسی گم شدہ عزیز یا کسی گم شدہ مال کے متعلق اخبار میں اشتہار دینا بہت مفید ہوتا ہے۔ اور گم شدہ شے کے پا لینے میں کامیابی ہوتی ہے۔

ملکی فوائد۔ اخبار کے جو فوائد بیان ہوئے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ فائدہ حاصل ہے کہ اخبار راعی اور رعایا کا ترجمان ہے۔ حکومت کسی قانون کو نافذ کرنے سے پہلے اُسے اخبارات میں شائع کر دیتی ہے۔ تاکہ اس کے متعلق رائے عامہ معلوم ہو سکے۔ رعایا کے لوگوں کو حق حاصل ہوتا ہے کہ اس قانون کے محاسن و معائب پر پوری آزادی سے تنقید کریں۔ پھر یہ تنقید اخبارات کے ذریعے ارکین سلطنت اور حاکم ملک تک پہنچتی ہے۔ اور لوگوں کے احساسات و جذبات کا اندازہ ہو جانے کے بعد اس قانون کی ترمیم و تنسیخ کی جاتی ہے۔ اسی طرح رعایا کو اگر مجموعی طور پر کوئی مشکل درپیش ہو تو اخبارات کے وسیلہ سے اس کا اظہار حکومت کے سامنے کیا جاتا ہے۔ اور بہت جلد اس مشکل کو حل کر دیا جاتا ہے۔ اگر لوگ انفرادی طور پر چاہیں کہ کسی ضلع یا علاقہ کے حاکمِ اعلیٰ تک اپنی معروضات پہنچائیں تو انہیں سخت

وقت کا سامنا ہوتا ہے۔ اور لمبا اوقات دربارِ شاہی تک رسائی ہی نہیں ہوتی۔ یہ اخبار کی برکت ہے کہ ایک معمولی آدمی اپنی تمام شکایات متعلقہ افسروں تک پہنچا دیتا ہے۔ اور حکومت ان شکایات کا ازالہ کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ملک کے اندرونی و بیرونی دشمنوں کی سرگرمیاں اخبارات کے ذریعے عوام تک پہنچتی ہیں۔ عوام الناس ان کی مدافعت کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ غیر ملکی صنعتوں اور تجارت و زراعت کی ترقی کے حالات پڑھ کر اپنے ملک میں ویسے ہی بہتر حالات پیدا کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اخبارات کے ذریعے ہمارے پیغامات دُوسرے ممالک تک اور اُن کے پیغامات ہم تک پہنچتے ہیں۔ اور اس طرح تمام اقوامِ عالم سے ہمارا رشتۂ محبت استوار ہوتا ہے۔

ایڈیٹر کے لئے ہدایات۔ اخبار کے جتنے فائدے بیان ہوئے اُن کا انحصار ایڈیٹر کی قابلیت پر ہے۔ ایڈیٹر علمی لحاظ سے اتنا قابل ہونا چاہیئے کہ مضامین کی زبان دانی کی غلطیوں کی اصلاح کر سکے۔ غیر ملکی اخبارات کے اقتباس کر سکے۔ غیر زبانوں کی اصطلاحوں کے ترجمے اپنی زبان میں لکھ سکے۔ واقعات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی بجائے انہیں معقولیت اور اختصار سے لکھ سکے۔ اسے تعصب سے بالاتر رہنا چاہیئے تاکہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کی صحیح ترجمانی کرے۔ اس طرح اس کا اخبار ہر دلعزیز ہوگا۔ نیز اسے راعی اور رعایا کے ثالث کے فرائض انجام دینے چاہئیں۔ جب حکومت کے پرزوں کی حرکت بے قاعدہ دیکھے یا دیکھے کہ قانون کا استعمال غلط ہو رہا ہے تو بے خوف ہو کر اعتراض کرے اور عوام کو حکومت کی بدعنوانیوں سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ذمہ دار حکام کو مشورہ دے کہ وہ قانون کا صحیح طور پر

استعمال کریں۔ اسی طرح اگر عوام قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیں۔ تو انہیں سختی سے روکے اور کوشش کرے کہ ملک میں شر اور بدامنی نہ پھیلے۔ جب کبھی کسی ملک میں فسادی عنصر بڑھ جاتا ہے تو عام طور پر اس کے ذمہ دار اخبارات کے ایڈیٹر ہوتے ہیں۔ جو معمولی باتوں کو ہوا دے کر لوگوں کو مشتعل کر دیتے ہیں۔ بہرحال ایڈیٹر کو جاننا چاہیئے کہ وہ قوم کا رہنما ہے۔ اور حکومت کا مشیر۔ اور اسے کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیئے جو دونوں میں سے کسی ایک کے مفاد کے خلاف ہو۔ اس احتیاط سے اس کی ذات بھی قابلِ قدر ہو گی اور اس کا اخبار بھی پسندِ عام کے عطر سے مہکے گا۔

۱۲۔ تعلیمِ نسواں

علم کی فضیلت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ اور یہ امر مسلّمہ ہے کہ اخلاق کی عظمت اور انسانی زندگی کی کامیابی علم سے وابستہ ہے۔ دُنیا میں کوئی انسان جاہل بننا یا بے وقوف کہلانا نہیں چاہتا۔ اس لیئے ہر ایک کو علم کی ضرورت ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ مرد علم سے بہرہ ور ہوں اور عورتوں کو زیورِ علم سے عاری رکھا جائے۔

زندگی گزارنے کے لئے جس طرح عورت مرد کی محتاج ہے اسی طرح مرد عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یوں سمجھئے کہ دو ساتھی ہیں جو مل کر ایک سفر طے کر رہے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے بغیر چل نہیں سکتے۔ ظاہر ہے کہ اگر دونوں کی رفتار برابر ہو گی تو سفر آسانی سے طے ہو جائے گا۔ اور اگر ان میں سے ایک کے پاؤں زخمی ہیں یا آنکھوں سے اندھا ہے یا اسی قسم کی کسی اور بیماری میں مبتلا ہے تو دوسرے کے لئے اس کا وجود ایک مصیبت

بن جائے گا۔ اور منزل پر پہنچنے کے لئے اسے بے حد تکلیف ہوگی اور شاید وہ اس کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ اسے جنگل میں تنہا چھوڑ دے اور خود سفر کی صعوبتوں کا شکار ہونے کے لئے اکیلا چل پڑے اور منزل پر پہنچ سکے۔

پس زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے جس طرح مرد کو علم کی ضرورت ہے اسی طرح عورت کو بھی ہے۔ اسی لئے شارع علیہ السلام نے فرمایا ہے:۔
طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ۔ (علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت کے لئے فرض ہے)۔ عورت جاہل ہو تو ایک پڑھے لکھے خاوند کی منظورِ نظر نہیں ہو سکتی اور اسی طرح خاوند ان پڑھ ہو تو تعلیم یافتہ بیوی اُسے پسند نہیں کرے گی۔ پس میاں بیوی میں محبت قائم رہنے کے لئے ضروری ہے کہ دونوں کے قوائے عقلی علم سے نشوونما پائیں تاکہ دونوں اپنے اپنے فرائض کی بجا آوری کے قابل ہوں۔ نیک و بد میں تمیز کر سکیں اور زندگی کے نشیب و فراز کو آسانی سے عبور کر سکیں۔

عورت کے فرائض مرد کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہیں۔ اسے کبھی بہن کی حیثیت سے اپنے دوسرے بھائی بہنوں سے شفقت کرنی ہوتی ہے اور کبھی ماں بن کر اولاد کی تربیت اور بیوی بن کر خاوند کی اطاعت کے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ جب اُسے گھر کی چھوٹی سی سلطنت کا انتظام کرنا پڑتا ہے تو اس کی ذمّہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ اور ان سب فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اسے علم کی ضرورت ہے وہ علم سے بہرہ ور ہو کر یہ جان سکے گی کہ بہن بھائیوں سے کس طرح حسنِ سلوک سے پیش آئے۔ کس طرح اولاد کی صحیح تربیت کرے اور کس طرح گھر کے آمد و خرچ کا بجٹ تیار کرے تاکہ خوشحال رہ سکے۔ اور کس طرح گھر کے ملازموں سے کام لے۔ وہ تعلیم یافتہ ہونے کی صورت میں

خاوند کی مزاج داں ہوگی۔ اور اُس کی خوشی حاصل کرنے کے وسائل مہیا کرسکیگی جاہل عورتیں نہ اپنی ذات کی آسائش کے اسباب مہیا کرسکتی ہیں اور نہ گھر کے کاروبار کو چلا سکتی ہیں۔ بات بات میں خاوند سے اُلجھنا۔ ملازموں سے لڑنا جھگڑنا اور بچوں کی صحت اور اخلاق کو خراب کرنا ان کی طبیعت میں داخل ہوتا ہے لوگ ہمیشہ ایسی عورتوں سے نفرت کرتے ہیں اور ایسی عورت کیلئے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں ہوتی پس عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ لکھنے پڑھنے میں مہارت تامہ حاصل کرے تاکہ عام مفید مطلب کتابیں پڑھ سکے۔ تحریر کے ذریعے اپنے خاوند اور دُوسرے رشتہ داروں کو اپنے حالات سے آگاہ کرسکے اور ان کی تحریریں پڑھ سکے بعض دفعہ خاوند کسی دُور دراز مقام پر چلا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں میاں بیوی کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو راز کی باتیں لکھتے ہیں۔ اَن پڑھ بیوی دُوسروں سے خط پڑھواتی ہے۔ تو راز فاش ہو جاتا ہے۔ نوشت و خواند کی قابلیت سے عورت وہ تمام کتابیں پڑھ سکے گی جن میں اصُولِ خانہ داری اور بچوں کی تربیت کا ذکر ہو۔ اور وہ اپنے ان فرائض سے بخوبی عہدہ برآ ہوسکے گی۔

اسے علم حساب میں بھی اتنی دستگاہ ہونی چاہیئے جس سے وہ گھر کے حسابات رکھ سکے اور گھر کی ضروریات خریدتے وقت دھوکا اور غلطی نہ کھائے۔ اُسے مختلف کھانے پکانے اور سینے پرونے کے کاموں سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہی وہ کام ہیں جن کی گھر کے اندر زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ جو عورت خود کھانا پکانا نہیں جانتی وہ کھانے کی لذت یا بے مزگی کا اندازہ نہیں کرسکتی۔ اور سچ یہ ہے کہ گھر کی خوشی کا زیادہ انحصار کھانے پر ہے۔ عید کا دن کتنا خوشی کا دن ہوتا ہے۔ خوشی کے دیگر لوازمات مہیا ہوں۔ لیکن کھانا کچا رہے یا بدمزہ پکے تو عید کی ساری خوشی خاک میں مل جاتی ہے۔ پس عورت کو کھانا پکانے میں

خصوصاً ماہر ہونا چاہیئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عورتوں کو وُہی تعلیم دی جائے جو مردوں کو دی جاتی ہے۔ اور بعض اس بات کے حامی ہیں کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ہی جگہ بٹھا کر تعلیم دی جائے۔ اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ چونکہ زندگی کی راہوں میں مردوں اور عورتوں کو دوش بدوش چلنا پڑتا ہے۔ اس لئے شروع سے ہی ان کو باہمی ربط سے رہنا سکھانا چاہیئے۔ لیکن یہ لوگ غلطی پر ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ مرد کے فرائض عورت سے مختلف ہیں۔ اور ہر ایک کو اپنے فرائض کے ادا کرنے کے قابل بنانا ہے۔ تو انہیں الگ الگ تعلیم دینی چاہیئے بچے کی پیدائش کے سلسلہ میں جو باتیں عورت کے علم میں آنی چاہئیں یا اولاد کی تربیت اور دیگر امور خانہ داری کے لئے تعلیم کی ضرورت جو عورت کو ہے مرد کو قطعًا اس کی ضرورت نہیں۔ مرد عورت کا محافظ ہوتا ہے اور زندگی کی حفاظت کی جو ذمہ داریاں مرد پر عائد ہوتی ہیں اور جن کے لئے اسے پہاڑوں کو کھودنا۔ دریاؤں کو چیرنا۔ سمندروں میں غوطے لگانا۔ جنگلوں کو کاٹنا۔ صحراؤں کو عبور کرنا۔ درندوں کو مارنا اور دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ عورت ان سے بالکل بے نیاز ہے پھر ایک جیسی تعلیم سے کیا فائدہ۔ تعلیم کی یکسانیت اور بے حجابانہ اختلاط سے عورت کے وہ تمام جوہر ضائع ہو جائیں گے۔ جن کے سبب وہ مرد کی محبُوب اور رفیقہ کہلاتی ہے۔ اور اگر ہم نے مخلوط اور یکساں تعلیم کے ذریعے عورت کو مرد کے برابر کھڑا کر دیا اور عورت بھی مرد بن گئی تو نظامِ زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے یہ دُعا کرنی پڑے گی کہ الٰہی مردوں کی زندگی بسر کرنے کے لئے عورتیں پیدا کر تاکہ تیری بنائی ہوئی دُنیا آباد رہے ✣

—— ۞ ——

۱۳۔ محنت سے عظمت ہوتی ہے

دُنیا میں دو قسم کے لوگ نظر آتے ہیں ایک وہ ہیں جو صبر و قناعت کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کا یہ کہنا ہے کہ خدا تعالےٰ نے جو کچھ ہماری قسمت میں لکھ دیا ہے۔ وہ مل جائے گا۔ مرنے اور محنت کرنے سے کیا فائدہ۔ یہ لوگ نکمے اور بے ہمت کہلاتے ہیں۔ اور سے

وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

یہ ناکارہ لوگ نہ اپنے لئے مفید ہوتے ہیں اور نہ دُوسروں کے لئے۔ سے

برابر ہے یاں ان کا ہونا نہ ہونا نہ کچھ جاگنا اُن کا بہتر نہ سونا

دُوسرے وہ لوگ ہیں جو محنت سے کام کرتے ہیں۔ خود کھاتے ہیں اور کما کر دُوسروں کو کھلاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر دُنیا کی آبادی کا انحصار ہے سے

دم اُن کا ہے دُنیا میں رحمت خدا کی انہی کو ہے بھبتی خلافت خدا کی

اگر غور سے دیکھیں تو دُنیا کا کوئی کام ایسا نہیں جس میں محنت درکار نہ ہو اور انسان کی دُنیا و آخرت کو بہتر بنانے والے سب کام محنت سے سرانجام ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمان خداوندی ہے۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ یعنی انسان کو اُس کی محنت کا ہی ثمر ملتا ہے۔ دُنیا میں جن شخصوں نے علم و فن میں کمال حاصل کیا۔ محنت سے کیا صرف ذہن کی تیزی حصولِ علم کا سبب نہیں کیونکہ سے

وہ غبی جو روز و شب محنت کرے امتحاں کے وقت ہوگا کامیاب

وہ ذکی جس کو ہو غرّہ ذہن کا نے کبھی دیکھے مگر موقع پر کتاب

فیل ہو جائے گا ذِلت پائے گا دے سکے گا کیا سوالوں کا جواب

دُنیا میں جس قدر مذاہب پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ بانیانِ مذاہب اور رہنمایانِ ملّت کی محنت و کوشش کا نتیجہ ہیں۔ حق پرستوں نے باطل کو مٹانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی اور باطل کے ہر حملے کا جواب نہایت ہمّت و استقلال سے دیا۔ ہر مصیبت کا مقابلہ کیا۔ لیکن ہمّت نہ ہاری اور حق کی اشاعت کے فرائض نہایت محنت سے سرانجام دیئے اور آخر کار کامیاب ہوئے۔

دُنیا کی رونق اور آبادی محنتی لوگوں کے سبب سے ہے۔ اور انسانی زندگی کے آرام و آسائش کی تمام اشیاء محنت سے حاصل ہوتی ہیں۔

محنتی لوگوں کو دیکھو۔ کوئی جوتے سی رہا ہے۔ کوئی کپڑا بُن رہا ہے۔ کوئی باغبانی کے کام میں لگا ہوا ہے۔ اور کوئی تعمیر کے کام میں مصروف ہے۔ کسی نے زمین اور پہاڑوں کو کھودنا شروع کیا ہے۔ تاکہ سونا۔ چاندی۔ جواہرات اور دُوسری معدنیات نکالے۔ اور کوئی سمندر میں غوطے لگا رہا ہے۔ تاکہ موتیوں سے مالا مال ہو جائے۔ غرض کارخانۂ قدرت میں جس طرح مٹی۔ پانی۔ آگ۔ ہوا اور دیگر اجرامِ فلکی کام میں لگے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح محنتی لوگ اپنے قدرتی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ابتدائے آفرینش سے اب تک دُنیا کی آبادی اور تہذیب و تمدّن میں جو ترقی ہوئی وہ محنتی لوگوں کے وجود بابرکت سے ہوئی اور اس محنت کی برکت سے وہ اشیاء ایجاد ہو رہی ہیں کہ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

زمیندار چلچلاتی دھوپ اور کڑکڑاتے جاڑے میں ہل چلاتا ہے کھیتوں کو پانی دیتا ہے۔ اور فصل کی رکھوالی کرتا ہے۔ اور محنتِ شاقہ سے

مخلوقِ خدا کی خوراک بہم پہنچاتا ہے۔ کیا آپ اس کی محنت کی داد نہ دیں گے۔ جس کے بغیر دُنیا کا زندہ رہنا محال ہے۔

تاجر سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔ اور اپنے ابنائے وطن کے لئے وہ اشیاء خرید کر لاتا ہے۔ جن کے بغیر اُن کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر اور طبیب رات دن ٹکریں مارتے رہتے ہیں تاکہ خواص الادویہ سے کام لے کر ایسے نسخے تیار کریں۔ جو مخلوقِ خدا کو مختلف بیماریوں کے وقت مفید ہوں۔ اور فی الواقعہ ان محنتی لوگوں نے مہلک امراض کے وہ نادر علاج معلوم کر لئے ہیں جن کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ قدیم الایام میں جب کبھی کشتی بنی ہوگی نوح علیہ السلام کی قوم نے اُسے معجزہ سمجھا ہوگا۔ جمشید نے آگ پیدا کرنے کی ترکیب نکالی تو لوگوں نے اُسے پیغمبر مانا۔ اگر وہ لوگ آج ہوتے اور ہمارے سائنس دانوں کو دیکھتے۔ جنہوں نے سطح سمندر پر ہی نہیں بلکہ اُس کی گہرائیوں کے اندر تیرنا شروع کر دیا ہے۔ بے تار ستون خبریں سنا رہے ہیں۔ ہواؤں میں اڑتے ہیں اور آسمان کے تارے توڑ کر لا رہے ہیں۔ تو اُن کی محنت کے سامنے سجدہ کرتے اور شائد انہیں خدا مانتے۔

غرض انسان کو جو فضیلت دوسری مخلوق پر حاصل ہے۔ وہ محض اس لئے ہے کہ وہ اپنی محنت سے کائنات کی ہر قابل تصرف چیز کو مفید بنا سکتا ہے۔ اور بناتا ہے۔ محض علم کسی فضیلت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ جب تک اُسے عملی جامہ نہ پہنایا جائے اور عمل کے لئے محنت اور ہمت کی ضرورت ہے۔ علم۔ صنعت وحرفت۔ تجارت۔ زراعت اور اسی قسم کے دُوسرے میدانوں میں جو لوگ نامور ہوئے محض محنت کی بدولت ہوئے۔ نادر شاہ معمولی گڈریا تھا بادشاہ بن گیا۔ رضا شاہ اور

مصطفیٰ کمال معمولی فوجی سپاہیوں کے بیٹے تھے بسلطنتوں کے حکمران بن گئے اور اسی طرح دوسرے بہت سے لیڈر عالم اور تاجر جو شہرۂ آفاق ہیں سب محنت اور کوشش سے نامور ہوئے ہیں۔ اور آج دُنیا جو حیرت انگیز ترقی کرتی جارہی ہے۔ محض محنت کے سبب کر رہی ہے۔ اور محنت کی عظمت نے انسان کو اتنا کمال بخشا ہے کہ ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

۱۴۔ تندرستی ہزار نعمت ہے

کوئی شخص بہت بڑا مالدار ہو اور عیش و عشرت کے جملہ لوازمات اُسے حاصل ہوں۔ اُس کی اولاد بھی کافی ہو اور کسی دشمن کا خوف بھی اُسے نہ ہو۔ جب وہ بیمار ہو جائے تو تمام نعمتیں اور عیش کے سامان اُسے کاٹے کھاتے ہیں۔ اُسے ہر شے سے نفرت ہو جاتی ہے۔ کوئی چیز کھائے تو بدمزہ معلوم ہوتی ہے۔ گویا بیماری اُسے تمام نعمتوں اور لذتوں سے محروم کر دیتی ہے۔ برعکس اس کے ایک تندرست آدمی پھٹے پرانے کپڑے پہنے کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر رُوکھی سُوکھی روٹی کھائے اور ٹھنڈا پانی پیئے تو اُسے بے حد لذت حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کی رُوح فرحت پاتی ہے۔ اسی لیئے کہا گیا ہے کہ "تندرستی ہزار نعمت ہے" اور بیماری ایک امتحان اور عذاب ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک آباد گھر میں جب کوئی بچہ بیمار ہو جاتا ہے تو اُس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے لیئے آرام حرام ہو جاتا ہے۔ گھر کے

سب افراد اُس کی تیمارداری کے لئے لگے رہتے ہیں۔ نہ دن کے وقت کسی کو آرام ملتا ہے اور نہ رات کو۔ اور بچّے کی بیماری گھر بھر کو مصیبت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اسی طرح عورت بیمار ہو جائے تو گھر کا سارا کام کاج بند اور خراب ہو جاتا ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے گھر کا مالک بیمار پڑ جائے تو آمدنی بند ہو جاتی ہے۔ یا باہر کے کاروبار کو سخت دھکا لگتا ہے۔ اور گھر والوں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ اگر سب افراد تندرست ہوں تو گھر میں چہل پہل رہتی ہے۔ اور ہنسی خوشی سے وقت گزرتا ہے۔

علم و فن کا حصول۔ زراعت کی پیداوار۔ تجارت کی کامیابی اور زندگی کے دُوسرے کاروبار تندرستی پر ہی موقوف ہیں۔ انسان تندرست ہو تو دنیا کے ہر کام کو سرانجام دے سکتا ہے اور خدا کی عبادت بھی کر سکتا ہے۔ تندرستی کی حالت میں دل کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ اور مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے دل میں ہمت ہوتی ہے۔ تندرست آدمی اپنی کوشش اور محنت سے ہر مشکل کا مقابلہ کر کے زندگی کی راہیں صاف کرتا ہے۔ ایک صحت مند جسم کے اندر دماغ بھی صحیح ہوتا ہے۔ اور دِل کی طاقت بھی مضبوط ہوتی ہے۔ اس لئے علم و فن میں کمال حاصل کرتا ہے۔ اور مختلف ایجادیں کر کے بنی نوع انسان کو فائدے پہنچاتا ہے۔ وہ ہر قسم کے کام میں آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور عزت پاتا ہے۔ لیکن بیمار آدمی نہ اپنے لئے مفید ہوتا ہے۔ اور نہ دُوسروں کے لئے۔ بیمار آدمی کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ ہر ایک سے لڑنا جھگڑنا اُس کی طبیعت بن جاتی ہے۔ وہ لوگوں سے نفرت کرنے لگ جاتا ہے۔ اور لوگ اُسے حقارت سے دیکھتے ہیں۔ اور وہ ایک ناکارہ عنصر بن کر

رہ جاتا ہے۔

پس خدا سے دُعا مانگنی چاہیئے کہ وہ قادرِ مطلق اپنے فضل و کرم سے ہمیں تندرست رکھے۔ کیونکہ تندرست آدمی خدا کی تمام نعمتوں کو حاصل کرسکتا ہے اور اُس کی شکرگزاری سے یہ نعمتیں بڑھتی رہتی ہیں۔ لیکن بیمار کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اب ہمیں ان باتوں پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ جن سے ہم تندرست رہ سکتے ہیں۔

تحقیقِ جدید سے بعض ایسی دوائیں تیار کی گئی ہیں کہ جن کو تندرستی کی حالت میں استعمال کرنا مفید ہوتا ہے۔ تاکہ مختلف وبائی امراض سے محفوظ رہ سکیں۔ اس سلسلہ میں ہیضہ۔ چیچک۔ طاعون اور ملیریا کے ٹیکے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جس موسم میں ان وباؤں کے پھوٹنے کا اندیشہ ہو۔ فوراً ٹیکہ کرانا چاہیئے۔ اس سے خون کے اندر ایسے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں جو وبا یا بیماری کے حملے کو روکتے اور جسم کو بیمار ہونے سے بچاتے ہیں۔ بیمار پڑ جانے کی حالت میں تو ہر شخص علاج کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے مگر دانشمندی یہ ہے کہ ہم اپنا معمول ایسا بنائیں جس سے بیمار نہ ہونے پائیں۔ اور اس مقصد کے لئے حفظِ صحت کے مندرجہ ذیل اصولوں پر کاربند ہونا چاہیئے:۔

۱۔ جسم کی صفائی۔ دن بھر کام کاج کرنے اور چلنے پھرنے سے بدن پر گرد و غبار پڑتا رہتا ہے۔ اور میل جم جاتا ہے۔ جس سے جسم کے مسام بند ہو جاتے ہیں۔ اور جسم کی ردی رطوبتیں پسینہ بن کر باہر نہیں نکل سکتیں اور جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ اس لئے صبح و شام نہانا چاہیئے اور اگر دو وقت نہانا نصیب

نہ ہو تو دن میں ایک دفعہ نہانا لازم ہے۔ تاکہ مسام کھلے رہیں اور جسم کی سستی اور تکان بھی دُور ہو جائے۔ سارے جسم پر تیل کی مالش اور خصوصاً بالوں کو تیل لگانا ضروری ہے۔ تاکہ جلد اور بال ملائم رہیں۔ کیونکہ ان کا سخت اور کھردرا ہونا بھی کئی بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ خارش جیسی نامراد بیماری جسم کو میلا رکھنے سے ہوتی ہے۔ آنکھوں میں سادہ سُرمہ لگانا۔ ناخن کٹوانا۔ حجامت بنوانا اور ہر روز دانتوں کو صاف کرنا صحت کے لئے ضروری چیزیں ہیں۔

۲۔ لباس کی پاکیزگی۔ لباس قیمتی نہ ہو تو نہ سہی۔ معمولی درجے کے پہننے اور اوڑھنے۔ بچھونے کے کپڑوں کو صاف رکھنا ضروری ہے۔ جب کپڑے میلے ہوں اُنہیں دھولینا چاہیئے۔ ورنہ میل جم کر کپڑوں میں جوئیں ہو جاتی ہیں۔ جو جسم کو کاٹتی رہتی ہیں۔ ویسے بھی صاف ستھرے لباس سے انسان کی عزت ہوتی ہے۔ اور غلیظ کپڑے پہننے والے کو لوگ حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ اَلنَّاسُ بِاللِّبَاسِ۔

۳۔ عمدہ غذا۔ عمدہ غذا سے یہ مراد ہے کہ باسی اور کچی یا سڑی ہوئی غذا نہ کھائیں۔ اور اسی طرح گلے سڑے اور کچے پھلوں کو منہ نہ لگائیں کھانا خواہ معمولی ہو۔ لیکن اچھی طرح پکا ہو۔ اور نمک۔ مرچ۔ مسالہ اندازے کے مطابق اس میں ڈالا گیا ہو۔ تو اُس کا کھانا صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔

۴۔ صاف پانی۔ صحت انسانی کے لئے پانی کی بے حد ضرورت ہے۔ اس لئے بدبودار یا رنگدار یا بدذائقہ اور گندے پانی کے پینے سے بچنا چاہیئے۔ کیونکہ گندے پانی سے ہی ہیضہ۔ پیچش۔ اسہال اور قبض

وغیرہ بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

۵۔ صاف ہوا۔ انسانی زندگی کا انحصار ہوا پر ہے۔ دم گھُٹ جائے تو موت آجاتی ہے۔ اس لئے صاف ہوا میں سانس لینا صحت کے لئے لازمی ہے۔ مویشیوں کے باندھنے والی جگہوں پر سونا۔ بند کمرے میں دیا جلانا اور بند کمرے میں سونا مضرِ صحت ہے۔ کیونکہ اس طرح تازہ ہوا نہیں ملتی۔

۶۔ کھانے پینے میں اعتدال۔ کھانا زیادہ مقدار میں کھایا جائے تو ہضم نہیں ہوتا اور بیماری کا باعث بنتا ہے۔ اسی طرح ضرورت سے کم کھایا جائے تو جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خوراک ہی جزوِ بدن بن کر طاقت پیدا کرتی ہے۔ اس لئے اعتدال سے کھانا چاہیئے ؎

نہ چنداں بخور کز دہانت بر آید
نہ چنداں کہ از ضعف جانت بر آید

۷۔ ورزش۔ ہر روز سیر و تفریح کرنا یا معمولی ورزش کرنا صحت کے لئے ضروری ہے۔ تاکہ غذا بھی ہضم ہو اور جسم کی تکان اور سستی بھی دُور ہو۔

۸۔ نیند۔ دن رات کام میں لگے رہنے سے آدمی بیمار پڑ جاتا ہے۔ اس لئے کچھ مناسب وقت سونا بھی چاہیئے تاکہ قوائے جسمانی و دماغی آرام حاصل کر کے دوبارہ کام کے قابل ہو سکیں۔ اور جسمانی نشو و نما کو زوال نہ ہو +

۱۵- دوست کی خصوصیات

دلا یاران سہ قسم اند ار بدانی — زبانی اند و نانی اند و جانی
بنانی ناں بدہ از در برانش — تلطف کُن بہ یارانِ زبانی
ولیکن یارِ جانی را بدست آر — بجانش جاں بدہ ار مے توانی

اے عزیز! جان لے کہ دوست تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اوّل زبانی دوست جو زبان سے دوستی کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اور جان نثاری کا دم بھرتے ہیں لیکن جب کوئی مصیبت آ جائے تو پھر ساتھ نہیں دیتے۔ دوم نانی دوست یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی فائدے یا غرض کے لئے کسی سے ملتے ہیں۔ اور اپنے دوست ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ لیکن جب فائدہ حاصل کرنے کا امکان نہ رہے یا غرض پوری نہ ہو تو ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور کسی دُوسرے شخص کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ اور ہر جگہ اسی قسم کی باتوں سے اپنا مطلب نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ دونوں قسموں کے دوست دراصل منافق ہوتے ہیں۔ وہ محبت کو بدنام کرتے ہیں۔ ان کا اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ تیسرے جانی دوست ہیں جو اپنے دوست کے لئے جان و مال قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے اور ہر مصیبت میں دوست کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہی وفادار دوستی کے لائق ہوتے ہیں۔ ایسے دوست مل جائیں تو اُن کی قدر کرنی چاہیئے اور خود بھی اُن کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ ؎

اُلفت کا جب مزا ہے کہ وہ بھی ہوں بیقرار — دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

دوستی کے متعلق کسی کا مقولہ ہے۔ ؎

دوستی نہ کیجو تین سے — لڑکا - پاگل - بے دین سے

یعنی تین قسم کے شخصوں سے دوستی پیدا نہیں کرنی چاہیئے۔ ایک وہ جو عمر کے لحاظ سے تم سے بہت چھوٹا ہو۔ کیونکہ جوان اور لڑکے کی کیا نسبت؟ لڑکا لڑکپن کی خصوصیات رکھتا ہے۔ وہ ابھی زندگی اور محبت کی ذمہ داریوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا پھر اُسے محبت کے میدان میں کھینچ کر امتحان میں ڈالنا حماقت ہے۔ دُوسرے دیوانے اور پاگل سے محبت نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ وہ ہوش و خرد سے عاری۔ نفع نقصان اور نیکی و بدی کی تمیز نہیں کر سکتا۔ دوست اور دشمن اس کے لئے برابر ہیں۔ وہ حالتِ دیوانگی میں اپنے عزیز ترین بھائی کو بھی نوچ ڈالتا ہے۔ پھر اس سے محبت کرنے سے کیا حاصل۔ تیسرے وہ شخص جو اپنا ہم مذہب نہ ہو۔ دوستی کے قابل نہیں۔ کیونکہ مذہبی رسوم کی پابندی اسے تمہارے ساتھ ایک جگہ اور ایک دستر خوان پر بیٹھنے نہیں دے گی۔ ایک مسلمان ایک بت پرست یا کافر و مشرک کو دوست بنا کر اگر چاہے کہ اپنے مذہبی احکام کو بجالائے تو اس کا دوست اس سے ناک بھوں چڑھائے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ محبت کے رشتہ کو استوار کرنے کے لئے دونوں میں سے ایک کو اپنا مذہب چھوڑنا پڑے گا۔ اسی لئے قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ اے مسلمانو! مومنوں کے سوائے کسی کافر کو دوست نہ بناؤ۔ اور پھر ایک جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ یہ کافر اور مشرک اس وقت تم سے خوش ہونگے جب تم انکے بتوں کو بُرا کہنا چھوڑ دوگے۔ تم توحید پرستی کو چھوڑ دو۔ تو یہ لوگ تمہارے دوست بن جائیں گے ورنہ نہیں۔

محبت جب حد سے بڑھ جاتی ہے۔ تو محبوب کے سوا باقی تمام اشیاء بھول جاتی ہیں۔ سوتے، جاگتے، چلتے، پھرتے ہر وقت محبوب کا خیال دامنگیر رہتا ہے۔ اسے عشق کہتے ہیں۔ عشق اگر حقیقی ہو یعنی خدا تعالےٰ سے کیا جائے تو محمود ہے۔ اور اسی سے انسان محبوبِ الٰہی بنتا ہے۔

لیکن مخلوقِ خدا سے عشق کرنا مذموم ہے۔ کیونکہ عشقِ مجازی کا مریض خدا کو تو بالکل بھول جاتا ہے۔ اور نفسانی خواہش کو پورا کرنے کے لئے دُنیا کی باقی چیزوں سے بھی قطع تعلق کرتا ہے۔ اور اپنے محبوب اور معشوق کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے وہ جائز ناجائز اور حلال و حرام کی تمیز نہیں کرتا۔ اس کی حالت مجنوں کی سی ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ دُنیا اور دین دونوں برباد کر لیتا ہے۔ لیلیٰ و مجنوں۔ شیریں و فرہاد۔ ہیر و رانجھا کے قصے اسی عشق مجازی کی داستانیں ہیں۔ جو لوگ دُنیا کو ترک کر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں چلے جاتے ہیں اور خدا سے لو لگا کر عشقِ حقیقی کا کمال حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ دُنیا کے باقی فرائض سے سبکدوش ہو چکے ہوں۔ یا اصحاب صفہ کی طرح ترکِ دُنیا پر مجبور ہوں تو اُن کا عشق خدا کو پسند ہوتا ہے۔ ورنہ وہ گنہگار ہوتے ہیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے انسان کو محض اپنی عبادت کے لئے پیدا نہیں کیا بلکہ خلافتِ الٰہی کا بار اس پر ڈال کر مخلوق سے متعلق کئی فرائض اس کے ذمے لگا دیئے ہیں۔ جن سے عہدہ برآ ہونا ضروری ہے۔ پس عشق و محبت پسندیدہ وہ ہے جس میں خالق اور مخلوق کے ساتھ علیٰ قدر مراتب تعلقات کو استوار کریں۔ سچی اور پکی محبت کئی مقامات پہ پیدا ہو سکتی ہے۔ ماں اپنے بچے سے اور بسا اوقات اپنے خاوند سے جو محبت کرتی ہے وہ عموماً عشق کا درجہ اختیار کر جاتی ہے۔ اور یہ جائز محبت ہے جو قانونِ قدرت کے مطابق پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک شاگرد اپنے استاد سے یا استاد اپنے شاگرد سے محبت کرتا ہے۔ یہ محبت گو حصولِ علم کے سلسلہ میں ہوتی ہے لیکن پائدار ہوتی ہے کہ اس کا اثر اخلاق فاضلہ کو جلا دیتا اور صیقل کرتا ہے۔ جانبین کی روحانیت کو فروغ ہوتا ہے۔ یہی وہ محبت ہے جو مرید کو مرشد سے

یا طالبانِ حق کو ذاتِ پیغمبر سے ہوتی ہے۔ اسی طرح دُنیا کے اور مقامات پر محبت کی مثالیں ملتی ہیں۔ کسی فن سے محبت کرنا اس فن کے کمال حاصل کرنے کا سبب ہے علم سے محبت کرنا روحانیت کے معراج کی دلیل ہے وغیرہ۔

مقامِ افسوس ہے کہ محبت یا دوستی کا مفہوم عام طور پر یہ لیا جاتا ہے کہ ماں۔ باپ۔ بہن۔ بھائی اور خدا و رسولؐ یا پیر و مُرشد کو چھوڑ کر کسی غیر سے محبت کی جائے تو محبت ہے۔ اور اسی محبوب سے دوست مراد لی جاتی ہے۔ اس لئے ایسے صاحبِ فہم حضرات کی رہنمائی کے لئے بھی چند باتیں بیان کرنی ضروری ہیں۔ انہیں جاننا چاہیئے کہ

(۱) دوست کے انتخاب میں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ اور غرض مند اور بیوقوف کی دوستی سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بیوقوف دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے۔

(۲) دوست کی رضا جوئی ملحوظ رکھنی چاہیئے۔ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے جو دوست کے خلافِ منشاء ہو۔

(۳) دوست کے عیبوں سے اسے خلوت میں آگاہ کرنا چاہیئے۔ عوام میں دوست کے عیبوں پر پردہ ڈالنا چاہیئے۔

(۴) دوست ناراض ہو جائے تو کسی وکیل کو درمیان میں لا کر اُسے منانا معیوب ہوتا ہے۔ خود ہی اس سے مل کر حالات کو بہتر بنانا چاہیئے۔

(۵) دوست کا راز کسی پر ظاہر نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ؎

رہے خیال یہ آئینِ عشق ہے اے دل   جو راز دار نہ ہوں گے وہ دار دیکھیں گے

(۶) کوئی مصیبت پیش آئے تو دوست کی خاطر جان و مال قربان کرنے سے دریغ نہ کرنا چاہیئے۔

(۷) محبت میں سلامتی طبع قائم رکھنی چاہیئے تاکہ اخلاقِ فاضلہ کی تکمیل ہوتی رہے اور محبت جنون کی حالت اختیار نہ کر جائے۔

۱۶- موسمِ بہار

موسمِ سرما ختم ہُوا۔ خزاں کی سختیاں مِٹ گئیں اور اُن کی جگہ بہار کی لطافتوں نے لے لی۔

بہار کیسا خوشگوار موسم ہے۔ نہ سردی کی ٹھِٹھر موجود ہے۔ نہ گرمی کی تپش۔ نہ لحافوں میں دبکنے کی ضرورت ہے۔ اور نہ تہ خانوں میں چھُپنے کی حاجت۔ ایک معتدل آب و ہوا زندگی کو پُر کیف بنانے کے لئے جلوہ گر ہے۔ کائنات کی افسردگی اور پژمردگی نشاط سے بدل گئی ہے۔ ہر جسم جو نشوونما کے قابل ہے بالیدگی کی طرف مائل ہے۔ عروقِ مُردہ میں جان پڑ گئی ہے۔ اور جس طرف نظر اٹھائیں حیات اپنے گوناگوں رنگوں میں ظاہر ہو رہی ہے۔ درخت جو خزاں کے ہاتھوں ٹُنڈ مُنڈ ہو چکے تھے۔ از سرِ نَو پھوٹ رہے ہیں۔ سُرخ و سبز کونپلیں ہوا میں لہراتی ہیں۔ یا درختوں کی زبانیں ہیں۔ جو خالق کا شکر بجا لاتی ہیں اور زندگی کے نغمے گاتی ہیں۔ چاروں طرف رنگ رنگ کے پھُول کھِل آئے ہیں اور ؎

زمیں میں دب رہے تھے جو نقوشِ آب و گِل نکلے
فدا ہونے کو نیچر پر گھروں سے اہلِ دل نکلے

موتیا کی کلیاں ہیں یا کسی خوبرو کے دانتوں کی قطاریں جو ذوقِ تبسم میں عُریاں دکھائی دیتی ہیں۔ نرگسِ مست پر کسی شوخ کی چشمِ خمار آلودہ کا گمان ہوتا ہے۔ گلاب کسی گلرُو کے رُخِ جانفزا کی طرح شاداب ہے۔ لالہ دلِ عشاق کی طرح داغدار۔ اور سنبل پیچاں زلفِ جاناں کی طرح پیچدار۔ بہار کہئے کہ رونقِ کائنات کی علمبردار یا حُسن کی نشاطِ کار۔ باغ کی اس کیفیت

سے اہلِ دل نثار ہے۔ قمری کی کُوکُو۔ فاختہ کی حق سرّہٗ۔ کوئل کی کُوک۔ اور مور کی ہوک کے ساتھ جب بُلبل نغمہ پرداز ہوتی ہے۔ تو فردوسِ گوش کی لذتیں تماشائیوں کو بے خود کر دیتی ہیں۔ میدانوں سے نکل کر پہاڑوں کی طرف جائیں تو قدرت کے عجیب جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ خودرو پھولوں سے پہاڑ ڈھک گئے ہیں۔ اور سرسبز و شاداب جھاڑیاں اس کثرت سے اُگ آئی ہیں۔ گویا پہاڑ نے سبز مخمل کی چادر اوڑھ لی ہے۔ برف نے ڈھلنا اور چشموں نے پھوٹنا شروع کیا ہے۔ پانی ہے کہ پارے کے سانپوں کی طرح ہر طرف چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ آبشار گرنے لگے اور موسیقی کے زیروبم کی کیفیت پیدا کرنے لگے۔ صنوبر و شمشاد کی شاخیں ہوا کے چلنے سے ہلتی ہیں۔ ایک دُوسری سے ملتی ہیں۔ گویا عروسِ بہار اپنی بچھڑی ہوئی سہیلیوں سے بغلگیر ہو رہی ہے۔ دریاؤں کا پانی پھلواڑیوں اور جھاڑیوں کے اندر پھر رہا ہے۔ یا مشاطہ وار ان حسینوں کو آئینہ دکھاتا ہے۔ خوشگوار ہوا آتی ہے۔ کہیں کلیوں کو چھیڑ جاتی ہے۔ کہیں غنچوں کو گدگداتی ہے اور شبنم کے قطرے جو گھاس اور پھولوں پر موتیوں کی طرح لگے تھے۔ ٹپ ٹپ گرتے ہیں۔ ان کو مادرِ گیتی کے آنسو کہئے جو ایک سال کی جُدائی کے بعد اولاد کو مل کر فرطِ مسرت سے بہ نکلے۔ بہار کے یہ اثرات کچھ نباتات کے لئے مخصوص نہیں۔ اس موسم میں حیاتِ انسانی بھی انگڑائی لیتی ہے۔ اور جذباتِ محبت جو خزاں نے یخ بستہ کر دیئے تھے از سرِ نو جوش مارتے ہیں۔

گلاب کا شاداب پھول جب رُخِ جاناں کی یاد دلاتا ہے۔ اور اس کی خوشبو سے محبوب کی زلفِ معنبر یاد آتی ہے۔ تو دل دیوانہ وار بے قرار

ہو جاتا ہے۔ قدرت کے فدائی جب نیچر کی بوقلمونی اور گوناگونی کا نظارہ کرتے ہیں اور بہار کی رنگینیاں ان کے دامن دل کو کھینچتی ہیں تو بے اختیار اُن کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ مشاہدۂ قدرت کرتے ہیں۔ اور جب مخلوق کو دیکھ کر خالق کا تصور پیدا ہوتا ہے تو بے ساختہ اُن کی زبان سے نکلتا ہے :-

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ۔

پھول کھلے ہوئے ہیں۔ کوئی بنفشی رنگ کا ہے۔ کوئی نیلوفری۔ کوئی سُرخ ہے اور کوئی سفید۔ اور پھر ایک ہی پنکھڑی میں مختلف رنگ بھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ یہ گلکاری اور رنگ آمیزی کسی انسان کا کام نہیں اور کہنا پڑتا ہے کہ

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۔ (یہ اللہ کی رنگ آمیزی ہے اور اُس سے بہتر کوئی رنگ نہیں بھر سکتا۔)

حُسن کی یہ مختلف تصویریں جو موسم بہار میں نظر آتی ہیں۔ فی الحقیقت جاذبِ دل ہوتی ہیں۔ اور سے

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا
کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا

گویا بہار آفرینش عالم کی یادگار ہے جو ہر سال منائی جاتی ہے۔ اور خلّاقِ بیچوں اپنی اس قدرتِ کاملہ کا ثبوت دیتا ہے جس سے اس نے کائنات کو پیدا کیا۔ اور بتایا ہے کہ جس طرح خزاں میں تمام جاندار اور نباتات پر موت کا جمود چھا گیا تھا اور ہم نے بہار میں ان کو قوتِ نامیہ بخشی اسی طرح ایک وقت ایسا تھا جب یہ دُنیا و مافیہا عدم میں تھی۔ ہم نے اسے نیست سے ہست کیا۔

موسم بہار کی مسرتیں کچھ ایسی کیف آفریں ہیں کہ خدا پرستوں کو ہی وجد میں نہیں لاتیں بلکہ دُنیا دار بھی اس کی دلچسپیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور دُنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جو بہار کے آغاز میں خوشی نہ منائے مختلف میلے اور تقریبیں بہار کے لئے مقرر ہیں۔ ہندوستانی بسنت کا میلہ اسی موسم کی آمد پر لگاتے ہیں۔ ترکستانی خوانِ یغما پر جمع ہو کر لطف اٹھاتے ہیں۔ ایرانی نوروز کے بہانے عیش اڑاتے ہیں۔ اور اسی طرح دیگر اہلِ عالم خوشیاں مناتے ہیں +

30

قاضی محمد اسمٰعیل پبلشر۔ پرنٹر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ۔ لاہور (پاکستان) سے چھپوا کر قاضی سنز۔ جان محمد روڈ۔ انارکلی لاہور سے شائع کیا۔